مؤلفہ

پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بریلوی بی اے (آنرز)

ناشر

اقبال اکیڈمی

۵۴ (الف) سرکلر روڈ - بیرون موچی دروازہ - لاہور

قیمت ۸ عہ ——————— محصول ڈاک ۱/۳ ...

طبع دوم ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ تعداد ایک ہزار

مطبوعہ عالمگیر پریس لاہور باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر

شائع کردہ

سید محمد شاہ مہتمم اقبال اکیڈیمی لاہور

فہرست مضامین

ناشرین کی طرف سے

علامہ اقبال نے مسلمانوں کی نہضت جدیدہ کے لئے جو کام کیا ہے
افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں نے اب تک اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ
نہیں لگایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اب تک اپنی موجودہ زبوں حالی و
پستی کا پورے طور پر احساس نہیں کیا۔ اور نہ اس صورتِ حال پر ہم
متاسف ہیں۔ برخلاف اس کے ہم پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہے۔ اور
ہم میں سے جو کوئی اس سکتہ سے ہوش میں آنے کی جد وجہد کر بھی رہا ہے
وہ بھی بیچارہ ابھی تک پریشان اور سخت کمزوری کی حالت میں ہے۔ یہی
وجہ ہے ابھی تک ہماری اکثریت نے اس صدائے جرس کو سنا ہی نہیں
جو اقبال ہمیں غفلت سے ہوش میں لانے کے لئے بجاتے رہے ہیں اب
جبکہ وہ رفیق اعلیٰ سے فردوس بریں میں جا ملے ہیں ہم پر جنھوں نے
نیم مدہوشی اور نیم ہوشی کی حالت میں "بانگ درا" کو سنا تھا "بال جبریل"
کو دیکھا تھا اور "ضرب کلیم" کی ضرب کھائی تھی، فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس کے
پیغام کو باواز بلند لوگوں کے کانوں تک پہنچائیں۔ "اقبال اکیڈیمی"
اسی مقصد کیلئے معرض وجود میں لائی گئی تھی۔ اور یہی کام کر رہی ہے آپ بھی
میرا ساتھ دیجئے ہم سب مل کر اس کام کو سرانجام دیں۔ وَمَا تَوْفِیْقُنَا اِلَّا
بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ۔

(سید) محمد شاہ، مہتمم اقبال اکیڈیمی

پیش لفظ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اگر آید دگر دانائے رازے
بدہ اُورا نوائے دلگدازے
ضمیرِ امتاں را پاک سازد
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

کسی قوم کو ایک وقتی و ہنگامی تحریک سے برانگیختہ کرکے اس سے
کوئی کام لے لینا محض زعامت ہے جس کے بیشمار نمونے ہمارے زمانے

میں موجود ہیں لیکن "ضمیر امتان را پاک ساختن" جسے قرآن کی زبان میں تزکیۂ نفوس کہنا چاہیئے صرف نبی کا منصب ہے جو اللہ کی طرف سے ملہم و مامور ہو۔ یا مقام نبوت کے اس شناسا کا کام ہے جو علم و حکمت کے علاوہ لطائف قلبی کی نعمت سے بھی مالا مال ہو، جو تعقل و تعشق دونوں سے بہرہ مند ہو، جو حکیم بھی ہو اور نے نواز بھی ہو جو صرف دماغ ہی کو قائل نہ کر سکتا ہو بلکہ دل پر بھی ضرب لگا سکتا ہو۔

اس لئے علامہ اقبال دعا مانگتے ہیں کہ اگر ان کے بعد کسی شخص کو علم صحیح حاصل ہو جاتے تو اے اللہ۔ اسے ایسی نوائے دل گداز دے کہ قلوب بھی اسکی طرف متوجہ ہو جائیں اور وہ امت محمدیہ کے ضمیر کا تزکیہ کر سکے۔

یہ سنت الٰہی ہے کہ وہ ہر زمانے میں روح عصر کے مطابق ایسے حکیم اور ہادی پیدا کر دیتا ہے جو "دلبری بے قاہری" سے کام لے کر پیغمبری کر جاتے ہیں۔ گو انھیں پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ پیغمبری کا مقام بہت بلند ہے۔ مولنا گرامی نے اقبال کے متعلق کیا خوب کہدیا۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال ۔۔۔ پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

امت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص اکرام ہے کہ اس نے گزشتہ تیرہ سو برس میں ہر زمانے کی ضرورت اور ہر عصر کے علمی وفنی رجحانات

لہ شاعر

کے مطابق ایسے جلیل القدر عالم حکیم اور مفکر پیدا کئے ہیں جنھوں نے اپنی بصیرت سے حضور سرورِ کائنات صلعم کے پیغام کو سمجھا۔ اور اپنی دلبر و دلفریب شخصیتوں سے امت کو مسحور کر کے اس پیغام کی حقیقی رُوح ان کے قلوب میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ علامہ اقبال بھی انہی نفوسِ قدسیہ میں سے تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے موجودہ دور میں تبلیغ پیغامِ مصطفوی کے لئے چن لیا تھا۔

تصور فرمائیے کہ اگر زمانۂ حاضر کا کوئی ملا یا صوفی یا لیڈر جن کے بیشمار نمونے آپ کے سامنے ہیں اس دور کے سرکش نوجوان کے سامنے حقایقِ دینی پیش کرنے کی کوشش کرتا تو اسے کون سنتا۔ جبکہ اس عہد کا تعلیم یافتہ نوجوان "مولوی" کی شکل سے بیزار ہے۔ نہ وہ اس کے پایۂ علمی کو معتبر سمجھتا ہے نہ اس کی سیرت کے متعلق حسنِ ظن رکھتا ہے نہ اسے زمانۂ حاضر کی تحریکاتِ علم و فکر کا آشنا سا سمجھتا ہے۔ اس کے سامنے یا تو وہ "قل اعوذیئے" ہیں جو امامتِ مساجد اور نمازِ جنازہ ہی کو دین سمجھتے ہیں۔ یا وہ "علماءِ کرام" ہیں جن کی آزادخیالی کی انتہائی پرواز کانگرس کا آلۂ کار بن کر مسلمانوں پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرنا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آزادیٔ فکر تفلسف سفسطہ اور زندقہ کے اس ہولناک دور میں اپنے محبوب کے پیغام کی تبلیغ ایک ایسے شخص کے سپرد کی جو فلسفۂ جدید کے دریا کا شناور، انگریزی

دانی کا پیکر، مدرسۂ فرنگ کا فارغ التحصیل، قانون کا ماہر اور منطقی استدلال کا
بادشاہ تھا۔ اللہ نے دیکھا کہ یہ شخص علوم جدیدہ کا ماہر ہونے کے علاوہ
لطائف قلب کے سرمائے سے بھی مالا مال ہے، چنانچہ اس نے اس کے سینے
کو پیغام مصطفےٰ کی بصیرت کے لئے کھول دیا۔ اور اس کے قول میں وہ
تاثیر دی کہ اس کشش دوریکے سے یقین نوجوان بے اختیار اس کی طرف
کھنچنے لگے۔ کوئی بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ شخص اس کے پایۂ علمی سے انکار
کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ سب اس کی آواز سننے پر مجبور تھے۔ اس لئے کہ وہ
انہی میں سے تھا۔ اور وہ سب اس کی جلالتِ علم کے سامنے اپنی بے حقیقتی کو
محسوس کرتے تھے۔

پھر یہ بات نہیں کہ اس نے اپنی فلسفہ دانی، شاعری اور شہرت کو
محسوس کرنے کے بعد معلم و مبلغ کا چولا پہن لیا ہو، بلکہ اس کے ابتدائی کلام
سے یہ ظاہر ہے کہ اسے روزِ ازل ہی سے اپنے عظیم الشان مشن کا احساس
تھا۔ وہ تیس سال ہی کی عمر میں یہ داعیہ رکھتا تھا کہ ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس میرا شعلہ بار ہوگا

اور اسی زمانے میں اسے دنیائے حاضر کی سب سے زیادہ مرعوب کن
چیز یعنی تہذیبِ مغرب کی بنیادی کمزوری اور ناپائیداری کا احساس تھا۔ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

چند روز کے لئے ذہنی اعتبار سے "تشکک" اور سیاسی اعتبار سے "قومیت و وطنیت" کے وساوس بھی اس پر وارد ہوئے لیکن اسکے مومن دل و دماغ بہت جلد اس جال سے نکل کر الٰہی صداقتوں کی بلندیوں پر پرواز کرنے لگے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ حالت بھی اس کے ارتقائے فکر میں ایک ضروری "مقام" کی حیثیت رکھتی تھی جس سے گزرنا ناگزیر تھا۔

اقبال نے تربیت فکر کے تمام مقامات طے کرنے کے بعد جونہی مسندِ ارشاد پر قدم رکھا اور اس کی صدائے حق شعر و موسیقی کی دلگدازی سے لبریز ہوکر فضائے ہند میں گونجی تو سب سے پہلے کسی نے اس کی شاعری کی داد دی۔ کوئی اس کی موسیقی پر جھومنے لگا۔ کسی نے ناک بھوں چڑھا کر اپنے جہل یا حسد کا ثبوت دیا۔ لیکن یہ آواز تیز تر ہوتی گئی یہاں تک کہ ملا، صوفی، انگریزی تعلیم یافتہ، عام مسلمان سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ سب کو اس کی آواز کی وقعت و اہمیت کا احساس ہونے لگا۔

اس نے زمانہ قدیم کے "مسلمان" شعرا و ملاحدہ کے خلاف بیباکی سے آواز

بلند کی۔ زمانۂ حاضر کے تمام نئے مسلکوں اور فتنوں پر تنقید کی جلیل القدر فلسفیوں کے خطرات و وساوس کا مضحکہ اڑایا۔ غرض ہر اس چیز کو جو مسلمانوں کو اصلی منہاج نبوت سے دور لے جانے والی تھی یا جس میں ضلالت فکر و عمل کا ذرا سا بھی شائبہ تھا، واشگاف کر کے اس کے متعلق صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ واضح کر دیا۔

مختصر طور پر اقبال کی خدمات اسلامی کا خاکہ یہ ہے۔

(۱) اس نے عجمی تصوف کے تار و پود بکھیر دئے اور بتایا کہ وحدت الوجود محض فلسفہ کا ایک مسئلہ ہے۔ اسے توحید سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ عقیدہ تمام شرک و بدعت اور بے عملی و ضلالت کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ اس نے بتایا کہ مسلمان کلام الٰہی سے تمسک اور رسول اللہ کی ذات سے عشق کئے بغیر دین و دنیا کی کوئی منزل طے نہیں کر سکتا حضور کے ساتھ اسے خود جو والہانہ عشق تھا وہ ضرب المثل ہو چکا ہے۔ لیکن اس نے اس عشق میں کبھی وہ غلو نہیں کیا جو بعض صوفیہ و فقرا کا خاصہ ہے کہ رسول کو خدا کی صفات میں شریک کر لیتے ہیں عشق اندھا ہوتا ہے لیکن اللہ اور رسول کا عشق تو بصیرت کی جان ہے۔

۳۔ اس نے ادبیات اسلامی کی اصلاح کے لئے نہایت مؤثر آواز بلند کی اور بتایا کہ یاس و حرمان، نالہ و زاری، بزدلی، جمود اور دنیا کی بے ثباتی کے جو خیالات و جذبات مسلمان ادبا و شعرا نے ظاہر کئے ہیں وہ بھی بہت

بڑی حد تک مسلمانوں کی موجودہ بدحالی کے ذمہ دار ہیں۔ اسلئے ادب و شعر کو ان لعنتوں سے پاک کر کے خیالاتِ عالیہ کا حامل بنانا چاہیئے۔

۴۔ اس نے تمام اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی مسائل میں اسلام کی رہنمائی کو اجاگر کر دیا اور جہاد کی صحیح حیثیت و اہمیت واضح کی۔

۵۔ اس نے آج کل کی جغرافیائی قومیت و وطنیت اور شعوبیت کے خلاف نہایت شدید احتجاج کیا۔ اور اتحاد عالمِ اسلامی کو مسلمانوں کی ترقی و نہضت کی شرط اولین قرار دیا۔

یہ بنیادی کام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اقبال سے لئے۔ اس کے نقد و نظر کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن اساسی مسائل یہی ہیں، باقی شاخوں کا حکم رکھتے ہیں۔

ہمارا عہد دنیا کے تمام گذشتہ عہود و اعصار سے زیادہ اہم ہے اس لئے کہ افکار کا جو تصادم اور ہیئتِ اجتماعی کی جو شکست و ریخت اور سیاسیات کے جو انقلابات ہمارے زمانے میں ہر لمحہ ظہور پذیر ہو رہے ہیں وہ ادوار ماضیہ میں مثال نہیں رکھتے۔ برق و دخان کی کارفرمائی اور زمان و مکان کی تسخیر نے افکار و اعمال کی دنیا میں ایک ہنگامۂ رستخیز برپا کر رکھا ہے۔ ایسے وقت میں سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ اسلام اپنی برتری و فوقیت کو اہل عالم پر ثابت کرے اور بتائے کہ یہی ایک نظامِ فکر ہے جو

دنیا کو سکون و راحت کی نعمت دے سکتا ہے۔ اس موقع پر ایک "فاروق" کی ضرورت تھی جو حق و باطل کو الگ الگ کر کے دکھائے۔ اور اسلام کے چہرے پر گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سال سے جو گرد و غبار جم رہا ہے اسے دور کر کے اس محبوبِ جمیل کا اصلی جمال دنیا پر واضح کر دے۔ میرا دعویٰ ہے کہ دورِ حاضر میں اقبال نے یہ خدمتِ فاروقیت بہت بڑی حد تک انجام دے دی ہے۔ اب اس کے نیاز مندوں کا فرض ہے کہ اس کے پیغام کی تشریح و تفصیل کریں تاکہ اسلام کے حقائق ہر دل و دماغ میں جاگزیں ہو جائیں

اس سلسلے میں میرے دوست پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا یہ عزم ہزار داد و تحسین کا مستحق ہے کہ انہوں نے اقبال کی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر ایک سلسلۂ رسائل کی تالیف شروع کر دی ہے اور یہ رسالہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ میں نہایت فخر کے ساتھ اپنے فاضل دوست کے اس علمی کارنامے کو مسلمانوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے سینے کو فہم حقائق کے لئے کھول دے اور انہیں اس سلسلے کو بخیر و خوبی انجام تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عبدالمجید سالک
مدیر روزنامہ "انقلاب"

لاہور
۱۴ اگست سنہ ۴۲ء

دیباچہ

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

دیباچہ

اپنی قوم کی خدمت کا جذبہ بچپن سے میرے دل میں موجزن رہا ہے۔ لیکن اس خواہش کی نوعیت کو متعین کرنے کے سلسلہ میں تین مختلف دَور میری زندگی پر وارد ہوئے ہیں۔ جن کو میں ذیل میں بالترتیب بیان کرتا ہوں۔

شروع میں میرا خیال یہ تھا کہ مناظرہ اور مباحثہ کے ذریعہ سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کروں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے میں نے دنیا کے مختلف مذاہب اور اسلام کے مختلف مذہبی گروہوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور جب ان پر خاصہ عبور ہو گیا تو مناظروں میں شرکت اختیار کی۔ لیکن شریک ہو کر اس حقیقت کا احساس ہوا کہ اول تو مناظرے اور مباحثے، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی غرض سے منعقد نہیں ہوتے، دوسرے اگر یہ نیت بھی ہو تو ان کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ مقصود بہت کم حاصل ہوتا ہے، ہر فریق اپنی بات پر اڑا رہتا ہے اور اختتام مناظرہ پر اپنے آپ کو فتحیاب خیال کر کے واپس جاتا ہے۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مناظروں سے دل اچاٹ ہو گیا۔

اس کے بعد دل میں یہ خیال آیا کہ مسلمانوں میں فلسفیانہ ذوق پیدا کیا جائے اور مغربی تعلیم و تہذیب کی بدولت جو ملحدانہ خیالات مسلمانوں میں سرایت کرتے جاتے ہیں ان کے ازالہ کے لئے لٹریچر تیار کیا جائے اور یورپ کے ملاحدہ کے رد میں کتابیں لکھی جائیں۔

اس مقصد کے حصول کی غرض سے فلسفہ اور الٰہیات کا مطالعہ شروع کیا اور THEISM پر جس قدر لٹریچر دستیاب ہو سکا اسے بالاستیعاب پڑھا۔ خواہش یہ تھی کہ عقلی دلائل سے واجب الوجود کا اثبات کرسکوں۔

۱۹۲۵ء میں جبکہ یہ خبط پوری شدت کے ساتھ دماغ پر مسلط تھا مجھے خیال آیا کہ لاہور میں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں وہ بڑے فلسفی ہیں کیوں نہ اُن سے استفادہ کیا جائے؟

یہ خیال تھا جو مجھے مجددِ عصر حکیم الامۃ، علامہ اقبالؒ کی خدمت میں کشاں کشاں لے گیا:

چند صحبتوں کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ عقل، مجرد عقل جو "ادب خوردۂ دل" نہ ہو تسلی نہیں بخش سکتی!

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است   عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

علامہ مرحوم کے ارشادات سنکر میرا ذہن اکبر مرحوم کے اس شعر کی طرف خود بخود مائل ہو گیا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

علامہ اقبال نے اس سلسلہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا، یہ دیباچہ اس کی تفصیل کے لئے موزوں نہیں ہے مختصر یہ کہ یہ دُوسرا دور بھی ختم ہو گیا۔

البتہ مرحوم کے فیضِ صحبت سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ قوم کی صحیح خدمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید اور حاملِ قرآن مجید صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے کی دعوت دیجائے اور ان عظیم الشان خطرات سے آگاہ کیا جائے جو اس وقت ہندوستان میں ان کی ملی ہستی کو لاحق ہو رہے ہیں۔

جب یہ نصب العین متعین ہو گیا تو اس پر عامل ہونا میرے لئے کچھ دشوار نہ تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں علامہ مرحوم سے بڑھ کر کسی شخص نے اس دوگونہ خدمت کو انجام نہیں دیا۔

علامہ مرحوم کے بے شمار احسانات میں سے سب سے بڑا احسان جس کے بار سے میری گردن ہمیشہ جھکی رہے گی، یہی ہے کہ ان کی صحبت کے طفیل میرا مقصدِ حیات متعین ہو گیا اور مجھے طمانیتِ خاطر حاصل ہو گئی۔

قبل ازیں میں جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو یورپ کے فلاسفہ اور ان کے خیالات کے متعلق سوالات عرض کیا کرتا تھا لیکن ۱۹۲۷ء سے میں نے صرف اُن کے کلام کو اپنی رُوح کی غذا بنا لیا۔

۱۹۴۰ء میں مجھے خیال آیا کہ حب اللہ نے مجھے یہ زریں موقع دیا ہے

تو کیوں نہ خود مصنف سے ان کی بعض تصنیفات پڑھ لوں؟ چنانچہ تین سال کے عرصہ میں میں نے علامہ مرحوم سے اسرار خودی، رموز بیخودی اور گلشن راز جدید تینوں کتابیں سبقاً سبقاً پڑھ لیں۔

میں اسے محض فضل الہی سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ سعادت حاصل ہو گئی، کیونکہ ۱۹۳۴ء سے علامہ مرحوم کی صحت خراب ہونے لگی اور حلق میں تکلیف پیدا ہو جانے اور آواز بیٹھ جانے کی وجہ سے اطباء نے انہیں گفتگو کرنے سے بھی روک دیا تھا، چہ جائیکہ مسلسل گھنٹوں تقریر کرنا۔

آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام پذیر تھے۔ درمیانی بڑے کمرے میں قالین بچھا رہتا تھا اور دیوار سے متصل صوفے پر علامہ مرحوم بیٹھے رہتے تھے اور ان کے سامنے قدموں میں قالین پر اپنی نوٹ بک کھول کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور جب حقائق و معارف کے موتیوں کی بارش ہوتی —— جب وہ شہنشاہ علم و فضل تقریر کرتا تھا —— تو میں اپنی بساط کے مطابق ان موتیوں سے اپنا دامن بھر لیتا تھا۔

نیوٹن نے لکھا ہے کہ "علم ایک سمندر ہے اور ہم اس کے کنارے بیٹھے ہوئے صرف سنگریزوں سے دل بہلاتے رہتے ہیں۔" میں نے اپنی آنکھوں سے علم کے سمندر کو موجیں مارتے دیکھا ہے! اب یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے سنگریزوں کی جگہ موتی مل گئے!

"ناظرین معاف کریں میں کیا لکھ رہا تھا جذبات کی رو میں کہاں بہہ گیا!

چونکہ علامہ کے کلام سے بڑھ کر مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف دعوت دینے کا اور کوئی مؤثر ذریعہ مجھے معلوم نہیں اس لئے ان کے کلام کی نشر و اشاعت کو میں نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیا ہے" - وَاللّٰهُ عَلٰى مَا اَقُوْلُ شَهِيْد -

خدا کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں اس قلندر کی رُوح پر جس نے میری زندگی میں معنی اور مقصد پیدا کر دیا اور جس کی نظر کیمیا اثر سے مجھے وہ طمانیت حاصل ہو گئی جس کے سامنے ہفت اقلیم کی بادشاہت، کوئی حقیقت نہیں رکھتی -

ہزار رحمتیں نازل ہوں اس قلندر پہ بنایا جس نے حقیقت کا راز داں مجھ کو

(سلیم)

یہ کتاب اسی مقصد کی تکمیل کا پیرایۂ آغاز ہے اور انشاء اللہ اس سلسلہ کے تحت آئندہ بہت سی کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے بشرطیکہ اسے بھی منظور ہو" الشعی منی والا تمام من اللہ" میں اس امر کی تصریح ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے کسی رنگ میں بھی، علم و فضل کا دعویٰ نہیں ہے اور میں اپنی کم مائگی سے بخوبی واقف ہوں لیکن جس بات نے مجھے اس

جسارت پر آمادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں جو لوگ خندقیں کھودنے یا زخمیوں کی تیمارداری کا کام کرتے ہیں وہ بھی ایک طرح سے مدافعت ہی کا فرض انجام دیتے ہیں اور اگرچہ ان کا مرتبہ افسرانِ فوج کے برابر نہیں ہوتا تاہم خدامِ وطن کی فہرست میں ان کا نام بھی درج کیا جا سکتا ہے۔

پیشِ نظر کتاب علامہ مرحوم کے پیغام کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کی ابتدائی اور بہت حقیر سی کوشش ہے: علامہ مرحوم کا پیغام اتنا وسیع اور عظیم بالشان ہے کہ اس کی کامل تشریح کے لئے بہت زیادہ سکونِ خاطر بہت وسیع مطالعہ اور بہت دقتِ نظر کی ضرورت ہے۔ میرا مقصد فی الحال یہ ہے کہ مسلمانوں میں علامہ مرحوم کے پیغام کو سمجھنے کا شوق اور ان کے فلسفہ کے مطالعہ کا ذوق پیدا ہو اور اس نقشِ ناتمام کو دیکھ کر بالغ نظر اصحاب کی توجہ دنیائے اسلام کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرنے کی طرف مبذول ہو سکے۔

یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ دنیائے اسلام نے گذشتہ چند سو سال میں علامہ مرحوم کے پایہ کا دوسرا انسان پیدا نہیں کیا ہے۔ ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ کسی حد تک ان خیالات سے ہو سکتا ہے جو امریکہ کے مشہور فاضل ڈاکٹر اسپرنگ لنگ (Sprengling) نے مدراس لکچرز کے متعلق رسالہ کریسنٹ مطبوعہ شکاگو ۱۹۳۲ء میں ظاہر کیے تھے فاضل موصوف

لکھنا ہے۔

مغربی دنیا نے باستثنائے معدودے چند ابھی تک سر
محمد اقبال کے علمی پایہ کو نہیں پہچانا۔ اور اسی لئے ہنوز ان کی
وہ قدر و منزلت نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق ہیں
سر محمد اقبال فی الحقیقت نہایت بلند پایہ مفکر اور مذہبی
فلاسفر ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان کا "فلسفہ بیش بہا جواہرات
کی کان ہے چونکہ وہ مسلمان ہیں بدیں وجہ ارباب مغرب کیلئے ان
کے حقیقی مقام رفیع کو دریافت کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا
ٹیگور یا گاندھی کے۔ مغرب کے ارباب نظر اگرچہ مشرقی ممالک کے
فلاسفہ اور لیکچراروں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں کوشاں ہیں
لیکن سب سے زیادہ قابل توجہ شخصیت ڈاکٹر اقبال کی ہے جو موجودہ
زمانے کے بہترین مسلمان ہیں اور ہر لحاظ سے مغرب کے بڑے سے بڑے
فلسفی کے ہم پلہ ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اقبال کے حقیقی مقام سے
آگاہ کر کے ارباب مغرب کو اس مسرت سے محروم کر دوں جو ان
کو اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب وہ بطور خود اقبال کے فلسفہ
کا مطالعہ کریں۔ مسیحی دنیا میں وہ شخص اپ ٹو ڈیٹ کہلانے کا
مستحق نہیں ہے جس نے اقبال کا مطالعہ نہیں کیا اور بدر اس

لکچر نہ سے پڑھ کر اقبال کی اور کوئی تصنیف بسیجی دنیا کو ان کے حقیقی مقام سے آگاہ نہیں کر سکتی۔"

ظاہر ہے یہ چھوٹی سی کتاب ایسے عظیم الشان انسان کے پیغام کو کما حقہٗ پیش کرنے کی مدعی نہیں ہو سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ آئندہ اوراق میں پیش کیا گیا ہے وہ سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اور مجھے یقین ہے کہ ان تصریحات کی روشنی میں اب ناظرین کو راقم الحروف کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی یا غلط فہمی کا موقع نہیں مل سکے گا۔

آخر میں میں تہِ دل سے اپنے محترم و مکرم دوست سید محمد شاہ صاحب ایم اے مہتمم اقبال اکیڈیمی کی نوازش بے پایاں کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جن کی توجہ اور نوازش کی بدولت یہ ناچیز کوشش زیورِ طباعت سے آراستہ ہو سکی۔ صاحب موصوف نے اس کتاب کی اشاعت میں حد سے زیادہ دلچسپی کا اظہار فرما کر نہ صرف میری دلی آرزو کی تکمیل فرمائی بلکہ اقبال کے پیغام کو اُجاگر کر کے قوم کے سامنے فیاضی اور علم نوازی کی ایک عمدہ مثال بھی قائم کر دی۔ جزاہ اللہ تعالیٰ فی الدارین۔

خاک نشین

یوسف سلیم

مسلمانوں کی موجودہ پستی اُس کے اسباب اور قوم کو اس حالت سے نکالنے کی چند کوششیں

محبّت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

اقبالؔ

خودی اور مذاہب عالم

ویدانت اور عیسائیت کی تعلیم | یہ سوال کہ خودی یا آتما (Ego) ایک لازوال حقیقت اور قائم بالذات جوہر ہے یا محض "مایا" اور فریب تخیل ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے، بنی نوع آدم کی علمی اور مذہبی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اخلاقی اعتبار سے ان کے طرز عمل کی نوعیت اسی سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں فلسفیانہ رجحان اور مذاق رکھنے والی تمام اقوام نے اپنی اپنی دماغی قابلیت اور افتاد طبع کے مطابق اس سوال کا جواب دینے میں حد درجہ کدوکاوش سے کام لیا ہے۔

ہندو حکماء اور فلاسفہ اس طرف گئے ہیں کہ "خودی" محض ایک فریب تخیل ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، چنانچہ ویدانت کی تعلیم ہے

"برہما ستیم، جگن متھیا، جیوو برہمیو ناپراہ" (آتما بودھ)

"موجود حقیقی ہے، یہ کائنات باطل ہے اور نفس ناطقہ برہما ہی ہے، دگر ہیچ"۔

دوسرا سوال ان کے سامنے یہ آیا کہ جب خودی فریب تخیل ہے تو

اس کے تسلسل اور قیام کا کیا باعث ہے؟

اس سوال کے جواب میں جو منطقیانہ موشگافیاں ہندو حکماء نے کیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کرم حیاتِ خودی کے تسلسل کا باعث ہے اور چونکہ زندگی کے جملہ مصائب کی بنیاد یہ تسلسل ہی ہے اس لئے ترکِ عمل سے اس تسلسل کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور چونکہ اس کے خاتمہ ہی سے "مکتی" حاصل ہو سکتی ہے اس لئے ترکِ عمل منطقی طور پر انسانی زندگی کا جو سراسر فریب ہے مقصد قرار پایا۔ نہ کرم ہونگے نہ دوسرا جنم ہوگا۔

یہ نظریہ جس کو قبول کرنے کا نتیجہ دنیا میں رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے "ویدانت" یا "ویدوں کی تعلیم کا نچوڑ" کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مبادیات کو ویاس جی نے مدوّن کیا اور نویں صدی میں شنکر اچاریہ نے جو منطقی طلسم اس نظریہ کے گرد باندھا اس نے ایک عالم کو اس کا گرویدہ اور پرستار بنا دیا۔ کم و بیش ساری ہندو قوم ترکِ عمل کے فلسفہ پر عامل ہو گئی۔ خودی ایک "سرابِ تخیل" اور تمام عالم "حلقۂ دامِ خیال" قرار پا گیا۔

اگرچہ ویدانت کے مقابلہ میں، جو صرف برھما[1] کو حقیقی قرار دیتا ہے

---

[1] واضح ہو کہ ہندو دھرم کی تری مورتی میں لفظ "برھما" خدا کی تخلیقی شان کا مظہر ہے لیکن ویدانت میں اس لفظ سے مراد "ہستی مطلق" جسے ہمہ اوست بھی کہا گیا ہے۔ (شنکر ۷۸۸ء تا ۸۲۰ء)

بودھ مذہب نے خدا اور خودی دونوں کو دائرۂ وجود سے خارج کر دیا یعنی خدا غیر موجود اور خودی محض تسلسلِ شعور ہے اور اگرچہ جین دھرم نے خالقِ کائنات کا انکار کر کے صرف خودی اور مادہ کو ہستی کا خلعت عنایت کیا لیکن حیات کا جو مقصد ان دونوں مذاہب نے اپنے سامنے

تا ۸۲۰ء) جو ہندوؤں میں ادویت ویدانت فلسفہ کا بانی ہوا ہے تمام کائنات میں صرف ایک ہستی کو حقیقی تسلیم کرتا ہے جو غیر متشخص اور غیر ذی صفات ہے اسی کا نام برہما ہے یہ برہما بلحاظ جوہر غیر معین اور غیر ذی شعور بھی ہے اس کے متعلق انسان کچھ بھی نہیں جان سکتا سوائے اس کے کہ وہ ہستی مطلق ہے اور غیر ممکن الفہم ہے حکیم اسپنسر (۱۸۲۰ء تا ۱۹۰۳ء) کا (Unknowable Absolute) اس تصور سے بہت کچھ مشابہ معلوم ہوتا ہے شنکر کے اس برہما میں عالم معلوم اور علم کے امتیازات سہ گانہ کبھی نہیں پائے جاتے۔

اس جگہ اس تصور الٰہ پر تنقید کا تو موقع نہیں ہے لیکن اتنا لکھنا ضروری ہے کہ شنکر کا یہ تصور جب اس کا منطقی تجزیہ کیا جائے تو نیستی یا غیر حقیقی وجود ثابت ہوتا ہے۔ ویدانتی کہتے ہیں کہ انفرادی شعور ان اشیاء میں پایا جاتا ہے جو محض فریبِ نظر (مایا) ہیں چونکہ اس قول کا قائل ذی شعور ہے لہذا فریبِ نظر ہے پس اس کا قول بھی دھوکہ ہوگا اب ان لوگوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ جب سب کچھ دھوکا ہے تو تمہیں اس قول پر کیوں اعتماد ہے؟

علاوہ ازیں جب برہما میں ذاتی شعور نہیں ہے تو ہے کیا؟ محض یہ کہنا کہ ذاتی شعور کی نفی کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہتا ہے وہ ہمیں تسلی نہیں دے سکتا جب برہما میں شخصیت اور انانیت ہے نہ صفات ہیں نہ شعور ذات ہے تو پھر ہے کیا؟ اور ہم

رکھا وہ ایسا ہے کہ ترک عمل ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اس لئے ان کے مذہبی نظام کا تار پود بھی ترک عمل اور رہبانیت ہی سے مرکب ہے اور یہ تینوں مذاہب ایک ہی راستہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔

بودھ کا نرواں اور جینی کا موکش دونوں ہندو کی مکتی کی طرح ترکِ عمل اور ترکِ دنیا ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ تینوں مذاہب مختلف انداز اور مختلف طریق سے ایک ہی چیز کی تعلیم دیتے ہیں یعنی ہستی کے طوق کو گلے سے اتار دینا اور خودی کو فنا کر دینا تاکہ نہ بانس رہے نہ بانسری بجے۔

پروفیسر ایم ہری یان ایم اے اپنی کتاب آوٹ لائینز آف انڈین فلاسفی صـ۲۴ پر لکھتے ہیں:

"موکش کے جو انسان کا آخری نصب العین ہے حصول کی کوشش اور اس کے حصول کے لئے ترک دنیا کے اصول کا اختیار — یہ دو عناصر ہندی فلسفہ کے جملہ مذاہب میں بطور قدر مشترک پائے جاتے ہیں"

نیز مسز سٹیونسن اپنی کتاب دی ہارٹ آف جینزم صـ۸۹ پر

اس کے متعلق کیا تصور قائم کریں؟

منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ویدانت کا برہما ایک غیر حقیقی وجود ہے۔

لکھتی ہے :-

"بودھ مذہب اور برہمنی مذہب کی طرح جین مذہب
بھی موت کے پنجہ سے نہیں، بلکہ قید حیات سے رہائی حاصل
کرنے کا ایک طریق ہے۔"

مجوسیت کا مرتبہ فلسفیانہ اعتبار سے ہندو دھرم سے کمتر ہے،
اگرچہ ابتدائی دور میں فلسفیانہ کنج کاویوں کے آثار نظر آتے ہیں لیکن
چند صدیوں کے بعد رسوم و روایات کا پہلو اس پر غالب آگیا۔ یہودیت
کی نظر اگرچہ ابتدا میں زندگی کے حقایق پر تھی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ مذہب بھی
قانون کی لفظی پابندی اور رسوم پرستی میں مبتلا ہو گیا۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم کی وساطت سے قدیم متمدن
دنیا کے بہت بڑے حصہ کے درمیان علمی ارتباط، اور تبادلۂ خیالات
کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں نے یونانیوں سے تناسخ کا عقیدہ
حاصل کیا۔ ایرانیوں نے جین دھرم سے اہنسا کا اصول اخذ کیا اور
اہل شام نے بودھوں سے ترک دنیا اور رہبانیت کا طریقہ سیکھا۔
شام اور مصر اس زمانہ میں نیم مذہبی اور نیم فلسفیانہ تحریکوں کے مرکز بنے
ہوئے تھے اور سکندریہ میں اشراقی فلسفہ نے اور دمشق میں فلسفۂ
معرفت نے بودھ دھرم سے ترک دنیا اور رہبانیت کے اصول اخذ

کئے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس ترکِ دنیا اور رہبانیت
کے فلسفے نے اشراقیت (neo-platonism) معرفت (gnos-
ticism) مثنویت (Manichaeism) اور متھرائیت
(Mithraism) چاروں مذاہب کو متاثر کیا اور ان چاروں
نے مسیحیت کے بنیادی اصولوں پر زبردست اثر ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ
ابتدائی مسیحیت کے خدوخال میں ہمیں جابجا بودھ مذہب کا رنگ
نظر آتا ہے اور آج تمام فضلائے مسیحیت اس حقیقت کا اعتراف کر
رہے ہیں کہ :-

"جناب مسیح نے اپنے پیروؤں کو رہبانیت[1] خانقاہیت
اور ترکِ دنیا کا سبق ہرگز نہیں دیا تھا"

---

[1] رہبانیت کا غیر فطری اصول جملہ مشہور مذاہبِ عالم میں پایا جاتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مذاہب انسانی فطرت کے مطابق نہیں ہیں۔

اسلام انسان کا فطری مذہب ہے، اس لئے قرآن مجید نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا کہ اللہ نے اس اصول کو مسیحیوں پر فرض نہیں کیا تھا: نیز ہمارے رسول پاک نے باآوازِ بلند ارشاد فرمایا ہے۔

"لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ"

اس اعلان نے اسلام کو جملہ ادیان پر تفوق عطا کر دیا اور آج ساری دنیا آہستہ آہستہ اسی تعلیم کی طرف آ رہی ہے۔

شکر ہے ڈاکٹر اے لے میکڈانل نے یہ بات کہہ کر قرآن مجید کی اس صداقت کو تسلیم کر لیا جو اس نے آج سے ۱۳۵۷ سال پہلے بایں الفاظ مسیحی دنیا کے سامنے پیش فرمائی تھی

"وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ مِمَّا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا" (سورہ حدید ع ۴)

ترجمہ:- اور جہاں تک رہبانیت کا سوال ہے سو یہ اصول انہوں نے خود ایجاد کیا، ہم نے اس طرز زندگی کو ان پر فرض نہیں کیا۔ اگرچہ انہوں نے خوشنودی الہی حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا لیکن جیسا نباہنا چاہئے تھا نہ نباہ سکے۔"

ان تصریحات کی روشنی میں اس بات کے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ مسیحیت نے رہبانیت اور ترک دنیا کا سبق کون سے استادوں سے سیکھا؟

رہا ترک عمل کا اصول جو مسیحیت میں پایا جاتا ہے تو یہ چیز اس نے (Mithraism) سے مستعار لی مشرقی مذاہب نے ترک عمل کا وعظ اس لئے کیا کہ زندگی مصیبت اور دکھ ہے اور اس عذاب سے نجات اسی صورت مل سکتی ہے کہ "کرم" نہ ہو۔ لیکن مسیحیت نے ترک عمل کا پیغام اس لئے دیا کہ جب "خدا کا بیٹا" ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گیا

تو اب صرف اس کے کفارہ پر ایمان لانا نجات کے لئے کافی ہے عمل اچھا ہو یا بُرا، سرے سے خارج از بحث ہے۔

پس ویدانت میں مکتی "گیان" پر منحصر ہے، مسیحیت میں ایمان پر اور ایمان بھی گیان ہی کی ایک صورت ہے۔ لہذا عمل کی ضرورت نہ اس میں ہے نہ اس میں۔

اسلام کی تعلیم | ساتویں صدی عیسوی دنیا کی مذہبی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس صدی میں ایک ایسا مذہب پیدا ہوا جس نے مذہبی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔ دور قدیم کا خاتمہ کر کے ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ اور حقایق سہ گانہ یعنی خدا کائنات اور انسان سے متعلق بالکل اچھوتی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی۔

اسلام از سر تا پا، پیغام عمل ہے۔ اس نے نجات کو ایمان صحیحہ اور اعمال[1] صالحہ پر منحصر کیا ہے اور وہ دنیا میں پہلا مذہبی نظام ہے جس نے رہبانیت نفس کشی اور ترک دنیا تینوں کو مذموم اور خلاف فطرت قرار دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں خودی ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل کی بدولت

---

[1] وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۱۲

لازوال ہو سکتی ہے جیسا کہ علامہ فرماتے ہیں ؎

دگر از شنکر و منصور کم گوے
خدا را ہم براہِ خویشتن جوے

ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است
خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

بہ بحرش گم شدن انجامِ ما نیست
اگر او را تو در گیری فنا نیست

خودی کے مقام اور مرتبہ کا اندازہ اس رباعی سے بخوبی ہو سکتا ہے

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

قرآن مجید نے مسلمانوں کو ذات و صفات باری میں اور دیگر مغیبات میں منطقی موشگافیوں اور قیاس آرائیوں سے منع کر کے ان کو اور ان کی طاقتوں کو عمل کی طرف مائل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چند صدیوں ہی میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت، علم و حکمت کے علمبردار اور تہذیب و تمدن کے مالک بن گئے۔

لیکن تیرھویں صدی عیسوی میں شیخ محی الدین ابن عربی نے بالکل اسی انداز میں قرآن مجید کی تفسیر دنیا کے سامنے پیش کی جس انداز میں شنکر نے گیتا کی تفسیر کی تھی۔ انہوں نے ویدانت کو وحدۃ الوجود کے

قالب میں ڈھالا اور اس عقیدہ کو اپنی شخصیت اور علم و فضل کے زور سے اسلامی دنیا کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔

سوءِ اتفاق سے اس نظریہ کے وجود میں آنے سے پہلے اسلامی دنیا میں بعض ایسے عوامل کارفرما ہو چکے تھے جن کی بدولت اس نظریہ کو مسلمانوں میں بہت آسانی کے ساتھ قبول عام کی سند حاصل ہو گئی۔

۱۔ مسلمانوں نے مصری اور شامی عیسائیوں کی صحبت میں رہ کر غیر اسلامی تصوف کے بعض ایسے اصول اپنی زندگی میں داخل کر لئے تھے جن کا ثبوت نہ قرآن مجید سے مل سکتا ہے نہ سنت رسول اللہ سے مثلاً نفس کشی اور ترک دنیا عزلت گزینی اور گوشہ نشینی خانقاہ اور تسبیح کے علاوہ فنا فی اللہ کا عقیدہ یہ سب باتیں سراسر غیر اسلامی ہیں۔ اور ذوقِ عمل کی دشمن۔ چنانچہ قرآن مجید واضح الفاظ میں ان سب اصولوں کی تردید کرتا ہے۔

۲۔ ایرانی لوگوں کا تخیل نسلی مناسبت کی بنا پر ہندی اقوام کے تخیل کی طرح آریائی تھا۔ اور مانی کی تعلیمات کی بدولت، ترک دنیا کا خیال ان میں راسخ ہو چکا تھا۔ اسلامی تعلیم نے اگرچہ انہیں عمل کی طرف مائل کیا لیکن وہ سابقہ اثر من کل الوجوہ زائل نہ ہو سکا۔

۳۔ گیارھویں صدی سے ایرانی مسلمان فلسفۂ یونان کی بھول

بھلیوں میں پڑ کر صراطِ مستقیم سے دور ہو چکے تھے اور فقہی اختلافات نے
فتنوں کی آگ کو اور بھی بھڑکایا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی عملی قوت اس
آگ کے شعلوں کی زد میں آ گئی۔ اس کی مثالیں چھٹی صدی کے اشاعرہ
اور معتزلہ کے مابین جو تحریری اور تقریری مناظرے ہوئے اُن سے بخوبی مل
سکتی ہیں۔

اندریں حالات جب شیخ ابن عربی کی تعلیم مصر، شام، عراق اور ایران
میں آئی تو لوگوں نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ علی
الخصوص ایرانی شعراء نے تو اپنا سارا زورِ کلام اس کی نشر و اشاعت کیلئے
وقف کر دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فارسی شاعری اس قسم کے خیالات
کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اوحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی
نے تو وحدت الوجود کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دے دیا اور رفتہ رفتہ
چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اسی رنگ میں رنگین ہو گئے۔

اگرچہ ہندو حکماء نے اس مسئلہ کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب
بنایا تھا اور ایرانی شعراء نے دل کو اپنے ناوکِ شعر کا نشانہ بنایا، لیکن
نتیجہ دونوں جگہ یکساں ہی مرتب ہوا یعنی ہندی اقوام کی طرح چھٹی
صدی سے مسلمان بھی ذوقِ عمل سے محروم ہو گئے۔

اگرچہ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس غیر اسلامی عقیدہ کے خلاف اپنی پوری

قوت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی لیکن واعظوں کی خشک بیانی شاعروں کی رنگین نوائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کہاں عقلی استدلال اور کہاں شعر کا جادو! یا یوں سمجھئے کہ کہاں منطق کی قیاس آرائی اور کہاں شعر کی دلرُبائی!

احیائے ملت کے لئے چند کوششیں | ہندوستان میں اسلام کا داخلہ فاتحانہ انداز میں ہُوا لیکن تُرکی فاتحین خود رُوحِ اسلام سے بیگانہ اور جوشِ تبلیغ سے معرا تھے اس لئے انہوں نے یہاں کے نومسلموں کی صحیح مذہبی تربیت کے لئے کوئی منظم کوشش نہیں کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ سلطان فیروز تغلق سلطان سکندر لودھی سلطان عالمگیرؒ کے علاوہ کسی بادشاہ نے اپنی توجہ تبلیغ اسلام کی طرف مبذول نہیں کی نتیجہ یہ نکلا کہ کثیر التعداد ہندو اپنے قدیم مذہبی خیالات ساتھ لے کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور مسلمان ہو جانے کے باوجود اسی آرزو میں رہے کہ قطرہ سمندر میں مل جائے چونکہ ہندوستان میں ان مسلمانوں کو قرآن مجید کی حقیقی تعلیمات سے روشناس کرنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا اس لئے مقامِ تعجب نہیں اگر ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے ذوقِ عمل کو محفوظ نہ رکھ سکا ہو۔ علماء کے جمود اور ان کی قدامت پرستی کا اندازہ اس بات سے

بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب ۱۱۵۱ھ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تو جانشینانِ رسول نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا کہ "یہ شخص مسلمانوں کو قرآن کے مطالب سے آگاہ کرنا چاہتا ہے اس لئے دائرہ اسلام سے خارج بلکہ واجب القتل ہے"۔

ذوقِ عمل سے محروم ہو جانے کا لازمی نتیجہ تلاشِ سکون ہوتا ہے۔ انسان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بجائے کنجِ عافیت کو محبوب رکھنے لگتا ہے۔ اور اس نکتہ سے غافل ہو جاتا ہے کہ "کنجِ عافیت" فنا کا دروازہ ہے۔ اسی لئے تو حکیم الامت نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے روشناس کیا ؎

"بدریا غلط و باموجش درآویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است"

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا لٹریچر مطالعہ کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ "لذتِ سکون" ہندی مسلمانوں کا نصب العین بن گیا تھا اور وہ سکون کے اس قدر دلدادہ بن چکے تھے کہ انہیں جنبشِ نگاہ تک گوارا نہ تھی ؎

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

لہ فتح الرحمان جو اقبال اکیڈیمی سے مل سکتا ہے

اسی رنگ میں ایک اُردو کا شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

دیکھ جو کچھ سامنے بھاتے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا

اس دور کی شاعری سراسر ترکِ عمل، تلاشِ سکون، تقلیدِ کور، جمود و خمود یاس و ناامیدی، قنوطیت اور ذہنی پستی کا مرقع ہے جس کے مطالعہ کا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ انسان حقیقت پژوہی اور حقیقت پسندی دونوں سے دور ہو جاتا ہے اور ایک خیالی دنیا میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے جہاں نہ کوئی تکلیف ہو اور نہ جدوجہد۔ مقامِ عبرت ہے کہ جس قوم کے اسلاف "بِاللَّيْلِ رُهْبَان وَ بِالنَّهَارِ فُرْسَان" کا مصداق تھے وہ قوم صراحی اور شیشہ بغل میں داب کر کنجِ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھی اور جس ہادیِ برحق نے مسلمانوں کو "رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً" کا درس دیا تھا۔ اور رہبانیت کو خلافِ اسلام بتایا تھا اس کی امت کی ذہنی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ سرے سے دنیا ہی کو معدوم تصور کرنے لگی۔ چنانچہ غالب لکھتا ہے ؎

"ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے"

یہ شعر نٹشے کے فلسفہ کی کتنی سچی تفسیر ہے جو ایک ہزار سال کے بعد انیسویں صدی میں مسلمانوں کے سامنے پیش کی گئی اور طرفہ یہ کہ اس کا مفسر فاتح خیبرؓ کا شیدائی ہے!

اسلامی زندگی عمل کی حدود سے جس قدر دُور ہو گئی تھی اس کا اندازہ اسی شاعر کے اس شعر سے ہو سکتا ہے۔ ؎

برلبِ "یا علی سرائے" بادہ روانہ کردہ ایم
مشربِ حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

۱۸۵۷ء کا ہولناک انقلاب اسی خواب کی تعبیر تھی جو مسلمان قوم گزشتہ چند صدیوں سے ہندوستان میں دیکھ رہی تھی اس انقلاب نے مسلمانوں کی غلامی اور بربادی دونوں پر مُہرِ توثیق ثبت کر دی قانونِ ایزدی "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ" کے ہمہ گیر دائرہ اثر سے آج تک دنیا کی کوئی قوم باہر رہ سکی ہے جو مسلمان باہر رہتے؟

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو   کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

قصہ مختصر انیسویں صدی میں مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی معاشرتی اور تمدنی بدحالی اپنی انتہا کو پہنچ گئی حکومت سے محرومی کے ساتھ ساتھ مذہب کا یہ اسلامی تخیل کہ وہ :—

۱- دین و دنیا دونوں کا جامع ہے۔
۲- مکمل ضابطۂ حیات ہے۔
۳- جنّت سماوی کے علاوہ جنّت ارضی کا بھی ضامن ہے یعنی وہ صرف عقائد و عبادات کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ فرد اور جماعت دونوں کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبہ میں کامل رہنمائی کر سکتا ہے۔
۴- ان کے دماغوں سے بالکل محو ہو گیا اور ٹھیک جس زمانہ میں دنیا کی دوسری اقوام سمندروں میں نئے جزیرے تلاش کر رہی تھیں وہ "اسم اعظم" کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ بجلی اور بھاپ کو مسخر کر رہی تھیں۔ یہ جنّات اور شیاطین کو قابو میں لانے کے لئے وظائف پڑھ رہے تھے وہ مختلف جڑی بوٹیوں کا تجربہ کرنے میں مشغول تھیں یہ کوّے کی حرمت اور حلت پر بحث کر رہے تھے وہ صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کر رہی تھیں اور یہ آمین اور رفع یدین کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔
اگرچہ مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور علمی انحطاط کا دور اٹھارہویں صدی سے شروع ہو کر انیسویں صدی کے وسط میں اپنی آخری منزل طے کر چکا تھا لیکن اس صدی کے ابتدائی زمانہ کے مسلمان اس گئی گذری حالت میں بھی زمانہ مابعد غدر کے مسلمانوں سے بہتر تھے، زمانہ ماقبل غدر کے مسلمان حکومت سے محروم ہو چکے تھے مگر

مذہب کی روح ایک حد تک ان میں باقی تھی کیونکہ وہ اس وقت تک خارجی غیر اسلامی اثرات سے محفوظ تھے۔ وہ "غیر تعلیم یافتہ" ہونے کے باوجود وجدانی طور پر اسلام کی حقانیت کے معترف تھے اور مذہب کو دنیا کی ہر شے پر مقدم رکھنے کا جذبہ اگرچہ بیحد کمزور ہو چکا تھا تاہم اس کا خفیف سا اثر ہنوز باقی تھا جس کی شہادت "خاک بالاکوٹ[1] کے ذرے" آج بھی دے سکتے ہیں۔

غدر کے بعد یہ آخری نعمت بھی مسلمانوں سے چھین لی گئی جس کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں تاہم مجمل طور پر کچھ عرض کرتا ہوں۔

۱۔ ۱۸۳۵ء میں سرکار دولت مدار نے انگریزی کو دفتری زبان قرار دیا۔ اور تبدیلی زبان کا نتیجہ ۶۰ ـ ۶۵ سال کے بعد یہ نکلا کہ مسلمان اپنے کلچر اور اپنی ملی روایات سے بیگانہ ہو گیا[2]۔

---

[1] جہاں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ دیکھئے "ہندی مسلمان"

[2] اسی پالیسی پر کانگریسی حکومتیں پورے سو سال کے بعد ہندوستان کے مختلف صوبوں میں عمل پیرا ہو رہی ہیں: سی پی اور بہار میں تو خاص طور سے "ودیا مندر" اور "بندے ماترم" کو مسلمانوں کے حلق میں ٹھونسا جا رہا ہے؛ اور اگر ہمارے مذہبی لیڈروں کی رموز دین سے بیگانگی کا یہی عالم رہا۔ اور مولوی حسین احمد مدنی اور مولوی ابوالکلام آزاد جیسے مفسران قرآن و حدیث حقیقت حال سے اسی طرح بے خبر رہے تو اب سے ۵۰ ـ ۶۰ سال کے بعد ہندی مسلمان بالکل "شدھ" ہو جائیں گے۔

۲۔ ۱۸۳۷ء میں ہندی مسلمان نے پہلی مرتبہ فارسی زبان میں اپنے مذہب کی تردید میں ایک ضخیم کتاب دیکھی، جسے کلیسائے انگلستان (C.M.S.) کے ایک نامور رکن نے تصنیف کیا تھا مسلمان کا دورِ محکومی ۱۷۵۷ء سے شروع ہوتا ہے لیکن عرصہ دراز تک حکمرانوں نے اس کے مذہب کی تردید کی جرأت نہ کی۔ ۸۰ سال کے بعد جب حکومت کو یقین ہو گیا کہ "رسی جل چکی ہے" تو باقاعدہ اسلام کی تردید کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی حمایت پر خود حکومت کے افراد کمربستہ تھے مثال کے طور پر سر ولیم میور سابق لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی واودھ کا نام لینا کافی ہوگا جنہوں نے مشنریوں کی حمایت کے علاوہ خود بھی اسلام کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے الغرض اسلام کے خلاف زہر چکانی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۶ء تک برابر جاری رہا جس کی رُوداد مولوی رحمت اللہ صاحب مہاجر مکی کی تصانیف سے معلوم ہو سکتی ہے۔

علمائے بلاشبہ مشنریوں کی تمام کتابوں کے دنداں شکن جواب دئے اور ہر مناظرہ میں ان کا ناطقہ بند کیا لیکن ان کتابوں کا تھوڑا بہت اثر ان مسلمانوں پر ضرور مرتب ہوا۔ جو رموزِ دین اور "سرنہی" سے بے خبر تھے

۳۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اگرچہ انگریزی تعلیم کا چرچا مسلمانوں میں بہت کم تھا تاہم بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مغربی خیالات

نے ۱۸۵۸ء سے ہندیوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا اور ان خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہب اور آخرت کا تصور انسان کی مادی ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب برادرانِ وطن نے دیکھا کہ مسلمان مقہور اور مغضوب ہیں اور ع

تھم بہ سبب شیوہ حقارت کی نظر

تو انھوں نے بھی مسلم خستہ جاں سے جگر میں چٹکیاں لینی شروع کیں ۱۸۷۵ء میں پنڈت دیانند صاحب بانی آریہ سماج نے ستیارتھ پرکاش لکھی جس میں قرآن مجید اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب دل کھول کر گالیاں دیں۔ عیسائیوں کی طرف سے پہلے ہی دل میں ناسور پڑ چکے تھے اب رہی سہی کسر اس کتاب نے پوری کر دی اور اس کی اشاعت کے بعد سے اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہندو اور ان کے ساتھی عیسائی طبقوں کی طرف سے دشنام طرازی اور بہتان تراشی

۱؎ اسی قوم نے ۱۵۷۵ء میں اپنی بیٹیاں مسلمانوں کو دی تھیں اور ان کے دینے کا سلسلہ ۱۷۱۵ء تک جاری رہا جبکہ فرخ سیر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ایک راجپوت کماری کو بیاہ کر لایا تھا لیکن جب وہ حکومت سے محروم ہو گئے تو اسی قوم نے اسی ملک میں بیٹیوں کے عوض گالیاں دینی شروع کر دیں۔ سچ کہا ہے کسی نے "اُترا شحنہ مردک نام"۔

کا وہ طوفان برپا ہوا کہ الاماں والحفیظ! نتیجہ اس ناپاک اور غلیظ لٹریچر کا یہ نکلا کہ بہت سے مسلمان نوجوان اسلام کی سچائی سے بدظن ہو گئے اور ان کے ایمان کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔

۱۸۸۵ء سے یعنی پچاس سال تک مسلسل انکار کے بعد مسلمانوں نے مجبوراً انگریزی پڑھنا اختیار کیا۔ علوم دین سے تو پہلے ہی بیگانہ ہو چکے تھے، اب جو مغربی علوم پڑھے تو نتیجہ یہ نکلا کہ ذہنیت اس درجہ مسموم ہو گئی کہ

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا
بتوں سے عشق میں پڑ ہی چکے تھے عقل پر پتھر
مسوں کا نئے تکلف چڑھ گیا ہر قلب پر پارا

مغربی تعلیم کے الحاد آفریں اثر کو جو چیز زائل کر سکتی ہے اس سے تو مسلمان دو سو سال سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ جب پشتیبان ٹوٹ جائے تو دیوار کے گرنے میں کیا دیر لگ سکتی ہے؟ لہٰذا کوئی تعجب نہیں اگر ہماری قوم کے نوجوان مذہب سے بدظن ہو گئے۔

۴۔ چونکہ حکومت کو مسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش کا تجربہ ۱۸۵۷ء میں ہو چکا تھا۔ اور وہ اس حقیقت سے واقف تھی کہ

ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

اس لئے برطانوی سیاست نے انیسویں صدی کے خاتمہ پر اپنے تھیلے سے ایک نیا نرتیج نکال کر ہندوستان کی بساط پر اچھالا۔ اور بات بھی معقول تھی! جب خدا نے انگریزوں کو ہم پر مسلط کر دیا تو کیوں نہ ان کو "اُولی الامر" بھی تسلیم کر لیا جائے؟ اور جب یہ حیثیت مسلّم ہو گئی تو پھر منطقی طور پر اسلام کے "دو جزو" نکل آئے، پہلا خدا کی عبادت اور دوسرا حکومت برطانیہ کی اطاعت۔

اسی مغربی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے طبقۂ علما کے ایک فرد یعنی مرزا غلام احمد نے ۱۸۹۷ء میں حقایق ملّیہ کو ان دلکش سروں میں الاپنا شروع کیا۔

لے دوستو! جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

یہ آواز گونجی اور ہزاروں مسلمانوں کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئی ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ بیسویں صدی کا مسلمان مذہب

لے دونوں مصرعوں میں لفظ "اب" آیا ہے پہلے مصرع میں 'اب' سے مراد یہ ہے کہ حالات بدل گئے ہیں اور انگریز کی حکومت ہے' اور حکومت نہیں چاہتی کہ مسلمانوں میں یہ سپرٹ باقی رہے دوسرے مصرع میں 'اب' سے مراد یہ ہے کہ پہلے یہ چیز جائز تھی مگر اب جبکہ انگریز الوالامر ہے اس لئے اسلام کا یہ حکم منسوخ کیا جاتا ہے۔

سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر بھی ہو گیا۔

اسی لئے ایک مرتبہ حضرت مجدد عصر علامہ مرحوم نے بہ سبیل تذکرہ راقم الحروف سے فرمایا تھا کہ

"آج سے سو سال پہلے کے مسلمان اگرچہ ہماری ہی طرح غلام تھے، لیکن اس حیثیت سے ہم سے بہتر تھے کہ ان میں غیرت ایمانی ہم سے زیادہ تھی اور ان کی رگوں میں لہو بالکل سرد نہیں ہو چکا تھا"

غالباً اب ناظرین اس امر میں مجھ سے اتفاق رائے کر سکیں گے کہ انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانان ہند کی مذہبی حالت بھی نہایت زار و زبوں ہو گئی تھی سیاسی اقتدار تو ۱۷۹۹ء میں ختم ہو چکا تھا، مذہب رہ گیا تھا لیکن مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر انیسویں صدی کے اختتام پر وہ بھی دلوں سے محو ہو گیا۔ اور لا ادریت بلکہ الحاد دلوں میں پرورش پانے لگا۔

بیسویں صدی کے مسلمانوں کی حالت کا نقشہ خود علامہ مرحوم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

مسلم از سرّ نبی بیگانہ شد | باز این بیت الحرم بتخانہ شد
از منات و لات و عزیٰ و ہبل | ہر یکے دارد بتے اندر بغل

شیخ ما از برہمن کافر تر است　　زانکہ او را سومنات اندر سر است
رخت ہستی از عرب برچیدۂ　　در خمستانِ عجم خوابیدۂ
شل ز برفابِ عجم اعضائے او　　سرد تر از اشکِ او صہبائے او
ہمچو کافر از اجل ترسندۂ　　سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ

(رموزِ بیخودی)

اب اسلامی ممالک کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے ؎

بطحی در دشتِ خویش از راہ رفت　　از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گردابِ نیل　　سست رگ تورانیانِ ژندہ پیل
آلِ عثماں در شکنجِ روزگار　　مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئینِ سلمانی نماند　　خاکِ ایران ماند و ایرانی نماند
سوز و سازِ زندگی رفت از گلش　　آن کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلمِ ہندی شکم را بندۂ　　خود فروشے دل ز دیں برکندۂ
در مسلماں شانِ محبوبی نماند　　خالد و فاروق و ایوبی نماند

(پیامِ مشرق)

اگرچہ اس عرصہ میں بعض دردمند مسلمانوں نے اپنی اپنی بساط اور
حیثیت کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی مثلاً

۱۔ مذہبی علوم کی حفظ و بقا کے لئے حجۃ الاسلام قاسم العلوم مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے ۱۸۶۷ء میں دیو بند میں ایک مدرسہ قائم کیا۔

۲۔ انگریزی علوم سے روشناس کرنے کے لئے سر سیّد نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں "مدرسۃ العلوم" قائم کیا۔

۳۔ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اور ان کو ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کرنے کے لئے حالیؒ نے ۱۸۷۹ء میں اپنی غیر فانی "مسدس" لکھی۔

۴۔ مسلمانوں کو ان کی پستی اور زبوں حالی کا احساس کرانے کے لئے اکبر الہ آبادی نے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو قوم کے لئے وقف کر دیا۔ اور طنز کے نشتر سے فاسد مادہ قوم کے جسم سے خارج کیا۔

۵۔ علماء کو جدید فلسفہ سے روشناس کرنے کیلئے مولانا محمد علی کانپوری ثم مونگھیری نے ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کی بنیاد رکھی۔

۶۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ۱۹۱۰ء میں کامریڈ جاری کر کے مسلمانوں میں ملّی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔

لیکن مُردوں کو زندہ کرنے کیلئے ایک "مسیحا" کی اشد ضرورت تھی یعنی بیسویں صدی کے مسلمانوں کو ایک ایسے "پیغامبر" کی ضرورت تھی جو زندگی کے مسائل ان کے سامنے کھول کر بیان کر سکے اور انہیں حقائق و معارف

قرآنیہ سے روشناس کر سکے ان کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑا سکے اور ان کے ہر مرض کا شافی علاج کر سکے جو نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو قرآن مجید کا پیغام سنا سکے اور ساری دنیا کے سامنے اسلام کی برتری ثابت کر سکے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے عین وقت پر جبکہ تمام دنیا مادیت اور الحاد تشکیک و انکار کی لعنت میں گرفتار تھی ایک مسیحا کو بھیجدیا جس نے موجودہ زمانے میں وہی فرض انجام دیا جو اسلام سے پہلے انبیائے بنی اسرائیل دیا کرتے تھے یعنی انسانوں کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دینا کیا خوب لکھا ہے حضرت گرامی نے

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

علامہ اقبال نے مسلمانوں ہی کو فوز و فلاح کا راستہ نہیں دکھایا بلکہ ساری دنیا کو خدا کے آخری پیغام کی طرف بلایا ہے اور جملہ اقوام عالم کی بیماریوں کا سبب تشخیص کر کے صحیح نسخہ تجویز کیا ہے وہ خود فرماتے ہیں

شکست کشتیٔ ادراک مرشدان کہن
خوشا کسیکہ بدریا سفینہ ساخت مرا

آئندہ اوراق میں ہم نے اسی مصلح اعظم کے شاندار کارناموں کی

ایک جھلک ناظرین کو دکھانے کی کوشش کی ہے میں خوب جانتا ہوں
کہ ان چند اوراق میں نہ تو ان کے کمالات کے تمام گوشے بے نقاب کیے
جا سکتے ہیں اور نہ خود مجھ میں ایسا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے
لیکن یہ صرف ایک کوشش ہے اور کوشش کا سبق خود علامہ مرحوم نے
مجھے پڑھایا ہے۔ ؎

برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالہ، آہے و فغانے

اس لئے امید ہے کہ ارباب کرم میری اس جسارت کو نگاہ لطف
سے دیکھیں گے اور میرے حق میں دعا کریں گے کہ اللہ مجھے اپنے حبیب
پاک کے صدقہ میں مسلمانوں کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ ؎

"در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے"

مقامِ اقبال

واضح ہو کہ اگرچہ قوم نے علامہ مرحوم کو ان کی زندگی ہی میں ایک پیغامبرؒ اور پیغامبر مصلح امت اور ترجمان حقیقت مسیحا اور رہنما کے القاب سے یاد کرنا شروع کر دیا تھا مثلاً ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے اسرار خودی پر تبصرہ کے ضمن میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ

"اقبال ایک مسیحا ہے جو بیسویں صدی کے مسلمانوں کو زندہ کرنے آیا ہے"

اور مولانا گرامی ہوشیارپوری نے اپنے مافی الضمیر کو اس طرح ادا کیا

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اور مولانا اسلم جیراجپوری نے ان کے متعلق یہ الفاظ سپرد قلم کیے ہیں کہ

"اگر مشیت ایزدی جو کام پہلے زمانہ میں انبیاء سے لیا کرتی تھی وہی کام اس نے اس زمانہ میں اقبال سے لیا ہے یعنی ہدایت و رہنمائی"

اور خود راقم الحروف کو بھی علی وجہ البصیرت یعنی اپنے ذاتی مشاہدہ

اور تجربہ کی بنا پر ان خیالات سے پورا اتفاق ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تعلیمات پر نظر ڈالنے سے پہلے اس باب میں علامہ کی حیثیت خود انہی کے الفاظ میں پیش کر دوں تاکہ کسی کو شبہ کی گنجائش نہ رہے اور میرے بیان کی تائید کے لئے ایک قیمتی دستاویز ہاتھ آجائے۔

واضح ہو کہ اگرچہ قدرت نے علامہ کو بہت سے کمالات معنوی کا جامع بنا کر بھیجا تھا مثلاً وہ شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی، سیاست دان بھی تھے اور نباض فطرت بھی نقاد مذہب بھی تھے اور صیرفیٔ ادب بھی صاحب علم بھی تھے اور صاحب نظر بھی، واقف اسرار مشرق بھی تھے اور دانائے رموز مغرب بھی، الغرض اگرچہ ان کی ذات والاصفات میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں لیکن جس چیز نے انہیں مسلمانان ہند ہی کی نہیں مسلمانان عالم کی نظروں میں محبوب بنا دیا تھا جس بات کی وجہ سے دنیائے اسلام میں انہیں وہ مقام رفیع حاصل ہوا جس کی نظیر گزشتہ چھ سو سال میں مشکل دستیاب ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو زندگی اور حرکت ترقی اور کامرانی کا پیغام سنایا، عزت رفتہ کو واپس لانے کا گر سکھایا، غیرت اور خودداری کا سبق پڑھایا، مشکلات زندگی پر غالب آنے کا راستہ دکھایا یعنی مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ از سر نو قرآن مجید کی طرف بلایا۔

اگر غیر مسلم حضرات ان کے اس مرتبہ کو نہ سمجھ سکیں یا سمجھنا نہ چاہیں تو

تو تعجب ہے نہ تاسف لیکن مسلمان بھی اگر علامہ کو محض ایک شاعر ہی سمجھتے ہیں تو ان کی یہ غلط فہمی ایک ناقابل معافی جرم ہی نہیں بلکہ خود ان کے حق میں سمّ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

بلا شبہ علامہ شاعر بھی تھے اور بہت بڑے شاعر مگر انہوں نے شاعری کو مقصود بالذات قرار نہیں دیا بلکہ اسے اپنے پیغام کو مسلمانوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا، یعنی انہوں نے اس عطیۂ الٰہی کو بھی مسلمانوں ہی کی بہبود میں صرف کیا اور کبھی اس بات کی آرزو نہ کی کہ میرے کلام کو نظیری اور کلیم کے کلام کے ساتھ تولا جائے۔

مثنوی اسرار خودی کے دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست

جن لوگوں نے اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے علامہ کو شاعروں کی صف میں شمار کر کے ان کے کلام کو ردیف اور قافیہ کی ترازو میں تولنا شروع کیا اور بعض نامانوس تراکیب کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی، ان سے علامہ نے اس طرح خطاب فرمایا ہے۔

من شکوهِ خسروی او را دہم	تخت کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من	آب و رنگِ شاعری خواہد ز من

کم نظر بے تابیٔ جانم ندید   آشکارم دید و پنہانم ندید

اس تصریح سے ثابت ہے کہ اگرچہ علامہ نے اپنے شاعر ہونے سے انکار نہیں کیا ہے لیکن وہ شاعری کو اپنا حقیقی مقام یا مقصد حیات نہیں سمجھتے دراصل ان کا منصب ہدایت ہے اور وہ مسلمانوں کو اس طریقہ پر چلانا چاہتے ہیں جس پر چل کر وہ دوبارہ حکومت اور سطوت حاصل کر سکتے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ انہوں نے نثر کے بجائے نظم کو اپنے خیالات و افکار کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے۔ اب ان کا دعوٰی انہی کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں ۔

۱۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری شاعری میں مسلمانوں کو درویشی اور شاہنشاہی کے رموز ملیں گے ؎

بگذر از نغمۂ شوقم کہ بیابی در وے   رمز درویشی و سرمایۂ شاہنشاہی

۲۔ وہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر دین اور سیاست کے رموز کھولے ہیں اور میں مسلمانوں کو ان سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں ؎

حق رموز ملک و دیں بر من کشود   نقش غیر از پردۂ چشمم ربود

۳۔ وہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے زندگی کے اسرار سے آگاہ فرمایا۔ اور میں مسلمانوں کو ان اسرار سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں ؎

تا مرا رمز حیات آموختند   آتشے در پیکرم افروختند

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام ۔ عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

۴ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرا کلام ایسے پیغام کا حامل ہے جس پر عمل
کرنے سے مسلمان دوبارہ اوجِ بلندی پر پہنچ سکتے ہیں ؎

عجم از نغمہ ہائے من جوان شد ۔ ز سودائم متاعِ او گران شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت ۔ ز آوازِ درائم کاروان شد

۵ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرے کلام کو محض شاعری نہ سمجھو بلکہ اس
میں جو زندگی کا پیغام جاری و ساری ہے اس پر توجہ کرو ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ ۔ سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ۔ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

اس سے ثابت ہوا کہ علامہ یوں تو شاعر بھی ہیں فلسفی بھی مگر دراصل
ان کا دعویٰ یہ ہے کہ میں "محرمِ رازِ میخانہ" ہوں ۔

۶ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! میرے سینہ میں جو آگ بھڑک رہی ہے
اگر بقدرِ ذوق و استطاعت اس آگ سے اپنا اپنا حصہ مجھ سے لے لو ۔
پس معلوم ہوا کہ علامہ "قاسمِ نارِ عشق" ہیں ۔

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر ۔ بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

۷ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس چیز نے مسلمانوں کی نظر میں مجھے محبوب
بنا دیا ہے وہ شاعری نہیں بلکہ میری قلندری ہے ؎

۸ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ دراصل خدا نے مجھے ایک جذبہ عنایت فرمایا ہے
مسلمانوں کی ترقی کا جذبہ ہاں وہ جذبہ شعر کے لباس میں ظاہر ہوا ہے ؂

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور

۹ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ نے شریعت اور طریقت کے رموز
سے واقف کیا ہے ؂

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

۱۰ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری شاعری انقلاب در بغل ہے محض الفاظ
کی بندش نہیں ہے ؂

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

۱۱ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں رازِ حرم سے باخبر ہوں ؂

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

۱۲ ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں قلندری کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوں
میرے پاس آؤ میرے کلام کو پڑھو تم بھی ان رموز سے آگاہ ہو جاؤ گے ۔

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

۱۳ - وہ فرماتے ہیں کہ میری زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنا سوزِ جگر مسلمانوں میں تقسیم کر دوں اور جو آگ میرے سینہ میں لگی ہوئی ہے وہی سب مسلمانوں کے سینوں میں روشن کر دوں ؎

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

۱۴ - وہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس توحید کے پیغام کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور میں اسی حقیقت کی طرف تمام مسلمانوں کو بلاتا ہوں ؎

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

۱۵ - وہ فرماتے ہیں کہ میں مقامِ حق پر قائم ہوں اور اعلائے کلمۃ الحق میری زندگی کا مقصد ہے ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال بہت بڑے شاعر تھے بلا شبہ یہ سچ ہے وہ بہت بڑے شاعر تھے مگر ان کا مقام اس نقطہ پر منتہی نہیں ہوتا وہ بہت بڑے شاعر تھے مگر وہ اس سے بھی بڑھ کر تھے وہ مسلمانوں کو ذوقِ نگہ عطا کرنے کے مدعی تھے وہ مسلمانوں کو آتشِ توحید میں جلنے کا طریقہ سکھانے کے مدعی تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر — سوختن در لا الٰہ از من بگیر

۱۶۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری شاعری کا مقصد ایشیائی اقوام [illegible] کو مغربی خیالات کے تسلط سے آزادی عطا کرنا ہے ؎

فکر شرق آزاد گردد از فرنگ — از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

۱۷۔ اپنے متعلق یہ پیشین گوئی فرماتے ہیں ؎

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے[1]

اس سے بڑھ کر بال جبریل میں فرماتے ہیں کہ میں نے ایک پست اور درماندہ قوم کو ترقی کا راز بتایا ہے۔ اس لئے میری وفات کے بعد میری قبر پر زائرین کا تانتا بندھا رہے گا ؎

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری — کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

"مسافر" میں انہوں نے اپنے مرتبہ اور مقام کے متعلق جو کچھ بیان فرمایا ہے

---

[1] یہ شعر ۱۹۲۳ء میں لکھا گیا تھا اور ۱۹۳۸ء میں یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی آج میرے مرشد کا مزار مبارک مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ دنیائے اسلام میں یہ تاریخی حیثیت رکھنے والا انسان مسجد شاہی کے سایہ میں آرام کر رہا ہے اور عشق رسول کے صلہ میں اس کی لحد زیارت گاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہے جس طرح زندگی میں وہ مسلمانوں کے قلوب پر حکمران تھا مرنے کے بعد بھی اسکی حکمرانی کا وہی رنگ قائم ہے اور انشاءاللہ تا قیامت قائم رہے گا۔ جس کے دل میں سرکار دو عالم کی محبت ہو وہ کبھی مر سکتا ہے؟

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں ان کے کلام کا ست نقل کر دیا جائے کیونکہ میں اس سے
بہتر انداز میں اپنے دعویٰ کو ثابت نہیں کر سکتا ؎

خاوراں از شعلۂ من روشن است — اے خنک مردے کہ در عصر من است
از تب و تابم نصیب خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر
گوہر دریائے قرآں سفتہ ام — شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
با مسلماناں غمے بخشیدہ ام — کہنہ شاخے را نمے بخشیدہ ام
عشق من از زندگی دارد سراغ — عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟ — با مسلماں حرف پرسوزے کہ گفت؟
ہمچو نے نالیدم اندر کوہ و دشت — تا مقام خویش بر من فاش گشت
حرف شوق آموختم و اسوختم — آتش افسردہ باز افروختم
با من آہے صبحگاہے دادہ اند — سطوت کوہے بکاہے دادہ اند
دارم اندر سینہ نور لا الٰہ — در شراب من سرور لا الٰہ
فکر من گردوں مسیر از فیض اوست — جوئے ساحل ناپذیر از فیض اوست

پس بگیر از بادۂ من یک دو جام
تا درخشی مثل تیغ بے نیام

اس تفصیل سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ علامہ کے کمالات شاعری
کا استخفاف کیا جائے ہرگز نہیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ

جو شخص انہیں محض ایک بلند پایہ شاعر سمجھتا ہے وہ ان کے حقیقی مقام اور مرتبہ اور منصب اور پوزیشن سے آگاہ نہیں ہے اس پر یہ شعر صادق آئیگا

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید

علاوہ بریں میں نے اس باب میں جو تفصیل سے کام لیا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں سے علامہ کی شخصیت کے متعلق تبادلۂ خیال کا اتفاق ہوا ان کی اکثریت کے متعلق یہ تجربہ ہوا کہ وہ علامہ کو محض ایک شاعر ہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت تمام خاص و عام پر واضح ہو جائے کہ اقبال کی شخصیت جامع کمالات ہے۔ اور شاعری اس کے کمالات میں سے صرف ایک کمال ہے لیکن اس کا سب سے بڑا کمال جس کی بدولت اس کا نام ہمیشہ مسلمانوں کے قلوب میں عقیدت کے جذبات برانگیختہ کرتا رہے گا، بلکہ اسے قیامت کے دن اپنے محبوب کی قدمبوسی کی سعادت حاصل ہوگی یہ ہے خدا نے آ سے مسلمانوں کی بگڑی بنانے کے لئے عین وقت پر دنیا میں بھیجا اور اس نے مسلمانوں کو وہی بھولا ہوا سبق یاد دلایا جو آج سے تیرہ سو سال پہلے اس کے آقا نے پڑھایا تھا۔ اس حقیقت کو خود اقبال ہی کی زبان سے سنئیے۔

مسلم از سرِّ نبی بیگانہ شد — باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
شیخِ ما از برہمن کافر تر است — زانکہ او را سومنات اندر سر است
نعشش از پیشِ طبیباں بُردہ ام — در حضورِ مصطفیٰ آوردہ ام
مُردہ بود از آبِ حیواں گفتمش — سِرّے از اسرارِ قرآں گفتمش

محفل از شمعِ نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم

گر دلم آئینۂ بے جوہر است — ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
تنگ کن رختِ حیات اندر برم — اہلِ ملت را نگہدار از شرم
خشک گرداں بادہ در انگورِ من — زہر ریز اندر مئے کافورِ من

روزِ محشر خوار و رُسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام — با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است یک دعایت مزدِ گفتارم بس است

عرض کن پیشِ خدائے عز و جل

عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

ان اشعار کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ علامہ مرحوم کا مشن کیا تھا اور ان کا حقیقی مقام اور منصب کیا ہے؟ بلا شبہ انہوں نے دنیا کے سامنے شاعری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں مگر اس سے بھی بڑھ کر انہوں نے اپنی شانِ مسیحائی کے کرشمے دکھلائے ہیں یعنی مردوں کو زندہ کر دیا اور اعجازِ عیسوی کا مرتبہ شعر و شاعری سے کہیں برتر ہے

پیغامِ اقبال

علامہ کے پیغام کو جو انہوں نے مسلمانوں کو دیا میں اپنی سہولت کے لئے مندرجہ ذیل چار عنوانات کے تحت بیان کروں گا۔

(۱) دعوتِ اسلام

(۲) اصلاحِ عقائد و افکار

(۳) تنبیہات

(۴) ہدایات

دعوتِ اسلام

توحید | علامہ فرماتے ہیں کہ عقلِ انسانی توحید ہی کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے اور انسان کو دین، حکمت، آئین، زور، قوت اور تمکنت سب کچھ اسی کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔

توحید الٰہی کا عقیدہ دافع بیم و شک ہے اور جب قلبِ انسانی ان دونوں خطرات سے پاک ہو جاتا ہے تو اس میں عملِ صالح کی صلاحیت اور اس کی آنکھ میں ضمیرِ کائنات کو دیکھ سکنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

فرماتے ہیں کہ توحید کا عقیدہ مسلمانوں کے لیئے بمنزلہ رُوح ہے یعنی مسلمانوں کی زندگی کا دار و مدار ہی توحید پر ہے ؎

ملتِ بیضا تن و جاں لا اِلٰہ   ساز ما را پردہ گرداں لا اِلٰہ

لا اِلٰہ سرمایۂ اسرارِ ما   رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

۲ - فرماتے ہیں کہ عقیدۂ توحید امتیازِ نسل و رنگ کو مٹا دیتا ہے؎

اسود از توحید احمر می شود   خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود

لیکن "لا اِلٰہ اِلّا اللہ" زبان سے ادا کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک اس حقیقت پر دل گواہی نہ دے مسلمان نہ تو دنیا میں انقلاب

پیدا کر سکتا ہے جس کا اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے اور نہ اس کے بازو میں وہ زورِ حیدری پیدا ہو سکتا ہے جو خیبر شکنی کے لئے ضروری ہے۔

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جاں تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں

ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

۳۔ اگر توحید کا سوز و ساز دل میں پیدا ہو جائے تو حکومت گویا ہاتھ باندھے سامنے کھڑی ہے اور باطل قوتیں سب پاش پاش ہو جائیں گی ؎

زیستن با سوزِ او قہاری است لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

۴۔ چونکہ خدا واحد ہے اس لئے اس نے تمام مسلمانوں کو ان کے وطنی اور اکتسابی امتیازات کو مٹا کر ایک قوم بنایا ہے اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ جس طرح وہ خدائے واحد کے پرستار ہیں۔ اپنی قومی ہستی میں بھی شانِ وحدت پیدا کریں ؎

آنکہ نامِ تو مسلماں کردہ است از دوئی سوئے یکی آوردہ است

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ؟ وائے برتو ہرچہ بودی ماندۂ؟

با یکی ساز از دوئی بردار رخت
وحدتِ خود را مگرداں لخت لخت

ملتے چوں می شود توحید مست   قوت و جبروت می آید بدست

فرد از توحید لاہوتی شود   ملت از توحید جبروتی شود

ہر دو از توحید می گیرد کمال
زندگی ایں را جلال آں را جمال

(۵) کائنات کی ابتداء اور انتہا سب توحید پر مبنی ہے ؎

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ   انتہائے کارِ عالم لا الٰہ

(۶) توحید ہی کائنات پر حکمران ہے ؎

لا و الّا احتسابِ کائنات   لا و الّا فتحِ بابِ کائنات

(۷) جب تک توحید کا حقیقی مفہوم دلنشیں نہ ہو اس وقت تک کوئی شخص انسان پرستی سے نجات نہیں پا سکتا ؎

تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست   بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

(۸) توحید غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکتی ہے ؎

بندہ را با خواجہ خواہی در ستیز؟   تخمِ لا در مشتِ خاکِ او بریز

جب تک غیر اللہ کی نفی کر کے اللہ کی ہستی کا اثبات نہ کیا جائے اس وقت تک مسلمان روحانیت کے مراتبِ عالیہ حاصل نہیں کر سکتا ؎

در محبت پختہ کے گردد خلیل؟   تا نگردد لا سوئے الّا دلیل

(۱۰) توحید کے سامنے کائنات کی کوئی حقیقت نہیں ہے ؎

این کہ می بینی نیرزد با دو جو   از جلالِ لاالٰہ آگاہ شو

(۱۱) سچا موحد کائنات پر حکمرانی کرتا ہے ؎

ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جملہ موجودات را فرمانرواست

الحاصل ؎

سمجھ میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے   ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

رسالت | علامہ فرماتے ہیں کہ :-

(۱) مسلمانوں کی خوبی و زیبائی، قدر و قیمت، اور ان کا دین و آئین سب کچھ صداقت رسالت محمدیہ پر منحصر ہے حضور انور کی ذات بابرکات کے ساتھ جو ہمیں ایک نسبت حاصل ہے اس کی بنا پر ہم ایک ملت ہیں اور آپ ہی کی عنایت و نوازش سے ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم تمام دنیا کے لئے رحمت اور برکت کا پیام ہیں ؎

ما ز حکم نسبت او ملتیم   اہل عالم را پیام رحمتیم

(۲) فرماتے ہیں کہ نبی اکرم مسلمان کے قلب و جگر کی قوت ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری نظر میں خدا سے بھی بڑھ کر محبوب ہیں ؎

... حمد فہم کنی تحقیق اگر   بنگری با دیدہ صدیق اگر

قوتِ قلب و جگر گردد نبی　　از خدا محبوب تر گردد نبی

(۳) حضور انور ہمارے محبوب ہیں کیونکہ ہم نے دینِ فطرت آپؐ ہی کی وساطت سے حاصل کیا جو ہمارے لئے سرمایۂ نجات ہے ؎

دینِ فطرت از نبی آموختیم　　در رہِ حق مشعلے افروختیم

(۴) تمام کائنات آپؐ ہی کے نور سے قیمت پاتی ہے اگر آپؐ کا وجود نہ ہوتا تو یہ کائنات ہیچ اور ناکارہ ہوتی ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ ست

(۵) حضور انور کا احسان بنی نوعِ آدم پر اس درجہ ہے اور آپؐ کی شان ایسی رفیع اور وقیع ہے کہ ایک انسان خدا کا انکار کر سکے لیکن آنحضرتؐ کا انکار نہیں کر سکتا۔

می توانی منکرِ یزداں شدن　　منکر از شانِ نبی نتواں شدن

(۶) آپؐ خاتم الرسل ہیں بایں معنی کہ لا نبیَّ بعدی کا نہ ظلی نہ بروزی نہ تشریعی نہ غیر تشریعی نہ حقیقی نہ مجازی نہ ایرانی نہ پنجابی آپؐ کے بعد کسی قسم کا نبی نہیں آسکتا۔ بابِ نبوت ہمیشہ کے لئے مسدود ہو چکا ہے اور جو شخص آپؐ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرتا ہے وہ وحدتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرتا ہے اور دائرہ اسلام سے قطعاً خارج ہے ؎

فرد از حق ملت از وے زندہ است — از شعاعِ مہر او تابندہ است

کثرت ہم مدعا وحدت شود — پختہ چوں وحدت شود ملت شود

زندہ ہر کثرت ز بند وحدت است — وحدتِ مسلم ز دینِ فطرت است

تا نہ ایں وحدت ز دستِ ما رود — ہستیِ ما با ابد ہمدم شود

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد

بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

(۷) آنحضرت صلعم سے محبت کرکے علامہ مرحوم نے ہمارے لئے عشق رسول کا ایک جیتا جاگتا نمونہ پیش کیا ہے۔

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار — یا رسول اللہ او پنہان و تو پیدائے من

علامہ کو آنحضرتؐ سے جو عشق تھا اس کا اندازہ اس رباعی سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — روزِ محشر عذرہائے من پذیر

ور حسابم را تو بینی ناگزیر — از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اس رباعی کے چوتھے مصرع میں شاعر نے آنحضرت کی قدر و منزلت کا اظہار اس انداز سے کیا ہے کہ اس پر شاعری کے سینکڑوں دیوان بلا تامل نثار کئے جاسکتے ہیں اور اپنے احساساتِ قلبی کی ایسی پرسوز اور وجد آفریں تصویر کھینچی ہے کہ پڑھنے والے پر بیخودی کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔

(۸) عشق رسول ہی مسلمان کی زندگی کا موجب ہے لہٰذا ہر مسلمان کو
عاشق رسول ہونا لازمی ہے ۔

مومناں اندر سپہر لاجورد — زندہ از عشق اند و نے از خواب و خورد
می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاع آفتاب مصطفیٰ است

زندہ تا سوز او در جان تست
ایں نگہ دارندۂ ایمان تست

کتاب | علامہ کی نظر میں یہ کتاب جسے ہم قرآن کہتے ہیں کتاب نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے فرماتے ہیں کہ :-

(۱) اگر اس کو سمجھ کر پڑھا جائے اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو مسلمان کی زندگی میں ایسا انقلاب پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کی بدولت وہ ساری دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے ۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

(۲) قرآن مجید نے ادیانِ باطلہ کے طلسم کو ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دیا ہے ۔

نقش قرآن تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست

(۳) قرآن فقر کی تعلیم دیتا ہے اور فقر ہی حکومت اور سروری کی بنیاد ہے ؎

جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

(۴) قرآنی فقر ذکر و فکر کے اختلاط کا نام ہے اور فکر انسانی ذکر الٰہی کے بغیر کامل نہیں ہو سکتی۔

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بذکر

(۵) قرآن سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

(۶) قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ دولت جمع مت کرو بلکہ کماؤ اور خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ سود خوری ایک لعنت ہے جس کی بنا پر انسان دائرہ انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ زمین خدا کی ملکیت ہے نہ کہ کسی انسان کی ؎

ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لن تنالوا البر حتی تنفقوا

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن
کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

(۷) قرآن مجید کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ جان ہتھیلی پہ رکھ لو یعنی باطل سے ٹکرانے کے لئے ہر وقت تیار رہو۔

۲۔ حاجت سے زیادہ جس قدر تمہارے پاس ہو وہ سب خدا کی راہ میں دے دو۔

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

(۸) قرآن مجید میں آب حیات موجود ہے ؎

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آب حیات

(۹) قرآن کے حقائق و معارف کبھی ختم نہیں ہو سکتے ؎

صد جہاں باقیست در قرآں ہنوز اندر آیاتش یکے خود را بسوز

(۱۰) قرآن مجید زندہ کتاب ہے اور انسانوں کے نام خدا کا آخری پیغام ہے ؎

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟ زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟

آں کتاب زندہ قرآن حکیم حکمت او لایزال است و قدیم

نسخۂ اسرار تکوین حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

حرف او را ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوع انساں را پیام آخریں حامل او رحمۃ للعالمیں

آخر میں مسلمانوں کو اس طرح نصیحت فرماتے ہیں ؎

اے گرفتار رسومِ ایمانِ تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

یعنی قرآنی اصولوں کو ترک کرنے کے بعد کوئی مسلمان اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں قرآن مجید ایسی کتاب ہے جو بوقت ضرورت نئی دنیا پیدا کر سکتی ہے ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
کہنہ گردد چوں جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

حریت | حریت اسلام کے شجر کا ثمر نورس ہے اور آنحضرت کا انسان پر سب سے بڑا احسان ہے ؎

حریت زاد از ضمیر پاکِ او — ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او

حریت کے معنی کیا ہیں؟ علامہ فرماتے ہیں کہ حریت سے مراد مادر پدر آزادی نہیں جو آج کل یورپ میں پائی جاتی ہے اور اکثر جہلائے ہند بھی اس کے طلبگار نظر آتے ہیں بلکہ حریت کے معنی ہیں صرف ایک زندہ اور قادر مطلق خدا سے ساتھ عہد و پیمان کر تاکہ یہ سر تیرے سوا اور کسی کے سامنے نہیں جھکے گا۔ اور تیرے آئین کے علاوہ اور کسی آئین کی پیروی نہیں کیجائیگی

حریت کے معنی ہیں عشق الٰہی میں سرشار ہو جانا یعنی مومن بن جانا اور ارباب نظر جانتے ہیں کہ علامہ کے مذہب میں عشق اولیں شرط اسلام ہے

طبع مسلم از محبت قاہر است ۔۔ مسلم ار عاشق نباشد کافر است

الغرض حریت کے معنی ہیں عشق کرنا اور بندۂ حر وہ ہے جو عاشق ہو اور غلام اس کے مرتبہ کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا ۔

جہاں میں بندۂ حر کے مشاہدات ہیں کیا ۔۔ تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

مومن بننے کے لئے عشق ضروری ہے اور عشق کے لئے حریت اسی قدر ضروری ہے جسقدر ناقہ کے لئے ساربان پس اس سے حریت کے مقام رفیع کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

حضرت امام حسین نے اپنے طرز عمل سے دنیا کو حریت کا سب سے شاندار درس دیا ہے ۔ علامہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کے طریق عمل کو ہر دم اپنے سامنے رکھیں امام حسین کون تھے اس کو علامہ کی زبان سے سنئے ۔

آں امام عاشقاں پور بتول ۔۔ سرو آزادے ز بستان رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر ۔۔ معنی ذبح عظیم آمد پسر
بہر آں شہزادۂ خیر الملل ۔۔ دوش ختم المرسلین نعم الجمل
سرخ رو عشق غیور از خون او ۔۔ شوخی ایں مصرع از مضمون او
درمیان امت آں کیواں جناب ۔۔ ہمچو حرف قل ہو اللہ در کتاب

جب مسلمانوں نے خلافت اسلامیہ کا رشتہ قرآنی اصولوں سے توڑ کر اسے ملوکیت کی شکل میں مبدّل کر دیا اور اس طرح حریت شخصی کا جو خاص عطیۂ اسلام تھی خاتمہ ہو گیا تو جناب سید الشہداء نے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی قربانی دے کر اس اصول پر پھر تصدیق ثبت کر دی کہ اسلام میں خلافت کوئی ذاتی ملکیت نہیں جو ورثہ کے طور پر باپ سے بیٹے کو پہنچ سکے۔

یزید کی اطاعت سے انکار کر کے انہوں نے اس حقیقت کو مبرہن کر دیا کہ ؎

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست ۔۔۔ پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد ۔۔۔ ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم[1] ۔۔۔ ز آتشِ او شعلہ ہا افروختیم

چوں اصول حریت، عقیدۂ توحیدِ الٰہی پر مبنی ہے اسی لئے علامہ نے یہ فرمایا۔ ؎

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است ۔۔۔ پس بنائے لاالٰہ گردیدہ است

یعنی حسینؓ نے دنیا میں توحید الٰہی کو از سر نو قائم کیا وہ اس طرح کہ اگر اسلام میں ملوکیت کی رسم داخل ہو جاتی تو جس طرح دوسرے مذاہب سے توحید خارج ہو گئی تھی اسلام سے بھی ہو جاتی اس کی تفصیل یہ ہے کہ یزید کا

[1] "رمزِ قرآں" سے مراد یہ ہے کہ ہر مسلمان کو باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اگر ضرورت ہو تو اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔

کا منشاء یہ تھا کہ اسلام میں ملوکیت کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن
ملوکیت منافی حریت ہے۔ اور فقدان حریت کا دوسرا نام غلامی ہے
ماسوا اللہ کی۔ اور غلامی ماسوا اللہ منافی توحید ہے۔ اس لئے اس اصول
کو تسلیم کر لینے سے عقیدۂ توحید فنا ہو جاتا ہے۔ اب پھر اس شعر کو پڑھئے۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است ۔۔۔ پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

اسی لئے علامہ فرماتے ہیں کہ موحد کسی انسان کا غلام نہیں ہو سکتا۔

ہر کہ پیماں با ہو الموجود بست ۔۔۔ گردنش از بند ہر معبود رست

لیکن یاد رکھئے۔

گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ ۔۔۔ آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اخوت | قرآن مجید میں آتا ہے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" یعنی سب
مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس اصول کو علامہ نے حکایت ابو عبید
و جابان سے واضح کیا ہے۔
جنگ ایران میں جابان نامی ایرانی سپہ سالار کو میدان جنگ میں ایک
مسلمان سپاہی نے قید کر لیا۔ اس نے عیاری کی راہ سے اپنا مرتبہ ظاہر نہ کیا
اور امان طلب کی۔ مسلمان نے شجاعت کے اصول کے مطابق اسے امان
دے دی۔ جب اسلامی فوج کو فتح حاصل ہوئی اور بعد فتح یہ معلوم ہوا کہ وہ

قیدی جسے جان کی امان دی گئی ہے جابان سپہ سالار ہے تو مسلمانوں نے
سیاسی مصالح کی بنا پر اور اس کی اسلام دشمنی کی بنا پر اس کے قتل کا
مطالبہ کیا۔ اس پر اسلامی سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ نے یہ کہا ؎

گفت اے یاران مسلمانیم ما — تار چنگیم و یک آہنگیم ما
نعرۂ حیدر نوائے بوذر است — گرچہ از حلق بلال و قنبر است
ہر یکے از ما امین ملت است — صلح و کینش صلح و کین ملت است
ملت ار گردد اساس جان فرد — عہد ملت می شود پیمان فرد
گرچہ جابان دشمن ما بودہ است — مسلمے او را امان بخشودہ است

خون او اے معشر خیر الانام
بر دم تیغ مسلماناں حرام

حقیقت یہ ہے کہ اخوت کا اصول قرآنی تعلیمات کا طغرائے امتیاز
ہے اور اللہ نے اپنے کلام پاک میں اس کو اپنی نعمتوں میں شمار فرمایا ہے

"فَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا"

اے مسلمانو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر نازل فرمائی
یعنی اسلام سے پہلے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس نے تمہارے
دلوں میں محبت پیدا کر دی اور اس کی برکت سے تم آپس میں بھائی بھائی

ہو گئے۔

اخوت جب افراد میں مرتبہ کمال کو پہنچتی ہے تو ملت میں وہ وحدت پیدا ہو جاتی ہے جس پر کامیابی کا دار و مدار ہے ؎

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ ... با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب ... یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب
یک نگاہی را بچشم کم مبیں ... از تجلیہائے توحید است ایں
ملتے چوں می شود توحید مست
قوت و جبروت می آید بدست

مساوات: اسلام کا ایک اصول مساوات ہے یعنی انسان ہونے کے لحاظ سے سب مسلمان ایک دوسرے کے برابر ہیں بادشاہ کو گدا پر کوئی تفوق حاصل نہیں ہے۔ علامہ نے اس اصول کو سلطان مراد اور معمار کی حکایت سے واضح کیا ہے سلطان مراد نے اپنے معمار کا ہاتھ کٹوا دیا اس نے قاضی کی عدالت میں فریاد کی جب قاضی نے سلطان مراد کو عدالت میں طلب کیا تو ؎

گفت[1] قاضی فی القصاص آمد حیات ... زندگی گیرد بایں قانون ثبات

---

[1] وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ (سورہ بقرہ)

عبد مسلم کمتر از احرار نیست — خون شہ رنگین تر از معمار نیست

چون مراد این آیہ محکم شنید — دست خویش از آستین بیرون کشید

مدعی را تاب خاموشی نماند — آیہ بالعدل والاحسان[1] خواند

گفت از بہر خدا بخشیدمش — از برای مصطفیٰ بخشیدمش

یافت موری بر سلیمانی ظفر — سطوت آئین پیغمبر نگر

پیش قرآن بندہ و مولا یکی است
بوریا و مسند دیبا یکی است

---

[1] انّ اللہ یامرکم بالعدل والاحسان (سورہ بقرہ)

اصلاحِ عقاید و افکار

ترکِ قرآن کی بنا پر رفتہ رفتہ بہت سے غلط عقائد اور خیالات مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں راہ پا گئے تھے۔ علامہ کو چونکہ اللہ نے مقامِ اصلاح پر فائز کیا تھا اس لئے آپ نے کمال عمدگی کے ساتھ ان تمام خیالاتِ فاسدہ کی اصلاح فرمائی ہے اس کی مثالیں مشتے بطور نمونہ از خروارے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

(۱) مسلمانوں کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ مذہب صرف چند عقائد اور رسوم کا نام ہے۔ اسے انسان کی سیاست، معیشت، معاشرت اور تمدن سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ علامہ نے اس غلط خیال کی اس طور سے اصلاح فرمائی۔

خطبہ صدارت الہ آباد کانفرس میں فرمایا۔

Islam is an ethical Ideal plus a certain

Kind of polity

یعنی اسلام ایک اخلاقی نصب العین بھی ہے اور ایک ضابطہ سیاست

و معاشرت بھی ہے -

نیز فرماتے ہیں۔ ؎

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

رشی کے فاقوں سے نہ ٹوٹا برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی بے بصیری

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری

---

(۳) مسلمانوں میں یہ غلط خیال راہ پا گیا تھا کہ عقل ہی سب کچھ ہے اور کائنات کے سارے اسرار و رموز اس کی مدد سے حل ہو سکتے ہیں بلکہ اس کی مدد سے ہم خدا تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

علامہ نے فرمایا کہ عقل چراغ راہ ہے اس سے کام لو مگر یہ تمہاری منزل نہیں ہے ؎

ترے سینہ میں دم ہے دل نہیں ہے — ترا دم گرمیِ محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل طمانیتِ قلب عطا نہیں کر سکتی۔ یہ دولت عشق سے حاصل ہوتی ہے ۔

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر — شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہیں — مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

محض عقل انسان کو خدا تک نہیں پہنچا سکتی ۔

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش — لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سربکف

محض عقل دل کے لئے موت کا حکم رکھتی ہے ۔

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو — یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

محض عقل یقین کا مرتبہ عطا نہیں کر سکتی ۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور — ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

محض عقل کی بدولت اسرارِ حیات آشکار نہیں ہو سکتے ۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است — عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

اصل حیات عقل نہیں ہے بلکہ عشق ہے ۔

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

چونکہ مسلمان اس کی حقیقت سے ناآشنا ہو چکے تھے اس لئے علامہ نے

اس جوہر کی صفاتِ عالیہ اس طرح بیان فرمائی ہیں ؂

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب — گاہ بحیلہ می برد گاہ بزور می کشد
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عقل ہم عشق است و از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست — لیکن ایں بیچارہ را آں جرأتِ رندانہ نیست
زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل — بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری ست
من بندۂ آزادم عشق است امامِ من — عقل است امامِ من عقل است غلامِ من
عشق با نانِ جویں خیبر کشاد — عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد

عشق سلطان است و برہانِ مبیں
ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں

عشق تہذیب اور دیں دونوں کے لئے بمنزلہ سنگِ بنیاد ہے

زندگی را شرع و آئین است عشق — اصلِ تہذیب است دیں دیں است عشق
دیں نگردد پختہ بے آدابِ عشق — دیں بگیر از صحبتِ اربابِ عشق

موازنۂ عقل و عشق ؂

عقل محکم از اساسِ چون و چند — عشق عریاں از لباسِ چون و چند
عقل می گوید کہ خود را پیش کن — عشق گوید امتحانِ خویش کن

(۳) مسلمانوں میں یہ غلط خیال راہ پا گیا تھا کہ زندگی ایک راز ہے ایک معمہ ہے چنانچہ اردو زبان کا ایک مشہور شاعر لکھتا ہے ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

علامہ نے اس غلط خیال کی یوں اصلاح فرمائی ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی؟ — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجودِ خود شہادت خواستن
چشم بر حق باز کردن بندگی است — خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ؎

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
زندگی جز لذتِ پرواز نیست — آشیاں با فطرتِ او ساز نیست
زندگی بے قوتِ اعجاز نیست — ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی — رُوحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی — خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

(۴) مسلمانوں میں یہ غلط خیال راہ پا گیا تھا کہ موت فنا ہو جانے یا زندگی کے خاتمہ کا نام ہے۔ علامہ نے اس کی یوں اصلاح فرمائی ـ

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست   موت نیرنگ و طلسم و سیمیاست
بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ   زندگی او را حسام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر   مرگ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست
مرگ آزادان ز آنے بیش نیست

---

(۵) مسلمانوں کی نظر سے اسلام کی حقیقت مستور ہو گئی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ محض کلمہ پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ کلمہ کے ساتھ ساتھ اعلائے کلمۃ الحق بھی ضروری ہے ـ

وائے درویشے کہ ہوئے آفرید   باز لب بربست و دم در خود کشید
حکم حق را در جہاں جاری نکرد   نانے از جو خورد و کراری نکرد
خانقاہے جست از خیبر رمید   راہبی ورزید و سلطانی ندید

فرماتے ہیں کہ جب مسلمان غیر اللہ سے توقعات باندھے وہ خواہ کلمہ ہی کیوں نہ پڑھتا ہو در اصل کافر ہی ہے ـ

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی   مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

فرماتے ہیں کہ اس کلمہ گو سے وہ کافر اچھا ہے جو بت پرستی میں سرگرم ہے ؎

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم — بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

مسلمان کون ہے؟ اس کا جواب علامہ ہی کی زبان سے سنئے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اسلامی زندگی کیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال — عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

خودی کا اثبات اصل اسلام ہے ؎

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است — منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

---

(۶) مسلمانوں کی نظر سے فقر کی حقیقت مستور ہو گئی تھی وہ سمجھتے تھے کہ فقر، فقیری، گداگری، گوشہ نشینی یا ترکِ دنیا کو کہتے ہیں علامہ فرماتے ہیں ؎ فقر و سلطنت ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں صرف تھوڑا سا فرق ہے ؎

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا — یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فقر کے سامنے سلطنت کانپتی ہے ؎

یقیں پیدا کر اے غافل! یقیں سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کہ جسکے سامنے جھکتی ہے فغفوری

فقر اسلام ہی کا دوسرا نام ہے ؎

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

فقر کی دولت سے محروم ہو جانے کا نتیجہ غلامی ہوتا ہے ؎

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

حقیقی بادشاہت کی بنیاد وہ فقر ہے جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغام مرگ دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

فقر قرآن اصل شاہنشاہی است

فقر قرآں اختلاط ذکر و فکر فکر را کامل ندیدم جز بذکر

---

(۷) ایک غلط خیال مسلمانوں میں یہ پھیل گیا تھا کہ اسلام میں نجات کا مفہوم محض انفرادی ہے یعنی ایک انسان کی کوشش تمامتر یہ ہونی چاہئیے کہ کسی طرح اس کی نجات ہو جائے دوسروں کی نجات سے اُسے کوئی سروکار نہیں ہے۔ نجات کا یہ غیر اسلامی تخیل ہندی مسلمانوں میں ہنود کے ساتھ اختلاط کی بنا پر پیدا ہوا اور اس کی تہ میں رہبانیت کا اصول کارفرما ہے جو سراسر اسلام کی روح کے خلاف ہے۔

اقبال نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ انفرادیت کی یہ زندگی یکسر غیر اسلامی زندگی ہے اور قرآن مجید کی روح کے خلاف ہے

جس کی تعلیم یہ ہے کہ فرد بحیثیت فرد کوئی معنی نہیں رکھتا اور جب تک فرد اپنے آپ کو ملت کے ساتھ پورے طور پر وابستہ نہیں کرے گا، اسلامی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اور جب اس کی انفرادی زندگی ہی نہیں تو نجات کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است

تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامہ احرار باش

حرز جاں کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطاں از جماعت دور تر

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشان و اختر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم — ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

در زبان قوم گویا می شود — بر رہ اسلاف پویا می شود

پختہ تر از گرمی صحبت شود — تا بمعنی فرد ہم ملت شود

ہر کہ آب از زمزم ملت نخورد — شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد

فرد تنہا از مقاصد غافل است — قوتش آشفتگی را مائل است

(۸) ایک یہ غلط خیال مسلمانوں میں راہ پاگیا تھا کہ اعمال صالحہ کے نتائج اخروی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ موجودہ دنیاوی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس غلط خیال کی اشاعت کا سبب یہ تھا کہ جیسے مسلمانوں کی مرکزیت فنا ہوگئی تو ان کی دنیوی زندگی میں ضعف و اختلال کے آثار رونما ہونے لگے اور اجتماعی زندگی کے مٹ جانے کی وجہ سے ان کے انفرادی اعمال اگرچہ وہ صالحہ تھے وہ نتائج مرتب کر سکتے تھے جو اجتماعی زندگی میں اسی دنیا میں مرتب ہو سکتے ہیں اور جن کی بدولت وہ دہلی سے غرناطہ تک حکمران بن گئے تھے۔ کیونکہ مشین کا پرزہ مشین سے جدا ہو کر لاکھ حرکت کرے کوئی محسوس نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا، اس لئے انہوں نے مجبوراً یہ کہہ کر دل کو تسلی دینی شروع کر دی کہ مومن کا اس دنیا میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ اس کی "ریاضت" کا صلہ اُسے آخرت میں ملے گا۔

اقبالؒ نے مسلمانوں کو بتایا کہ یہ خیال سراسر غلط ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ وہ تو مومنوں سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم اعمال صالحہ بجا لاؤ گے تو آخرت کے علاوہ اس دنیا میں بھی سروری حاصل کرو گے مسلمانو! اگر تمہارے اعمال صالحہ سے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو ضرور تمہارے طرزِ عمل میں کہیں نہ کہیں کوئی خرابی یا نقص موجود ہے بالفاظِ دیگر اگر تمہارے اعمال صالحہ سے وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا جس کا وعدہ قرآن

نے کہا ہے تو صاف لفظوں میں یوں سمجھو کہ تمہارے اعمال جن کو تم اعمال صالحہ کہتے ہو
در اصل اعمال صالحہ نہیں ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ وحدت ملی مفقود ہے

مردهٔ؟ از یک نگاہی زندہ شو　　بگذر از بے مرکزی پائندہ شو
ملت از یکرنگیِ دلہاستے　　روشن از یک جلوہ این سیناستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے　　در ضمیرش مدعا باید یکے
ما سوا از بہر تسخیر است و بس　　سینۂ او عرصۂ تیر است و بس
اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ　　عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را　　دوں مخواں این عالم مجبور را
غایتش توسیع ذاتِ مسلم است　　امتحانِ ممکناتِ مسلم است

حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد
جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد

چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ؟　　با ہزاران چشم بودن یک نگہ
ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب　　یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب

ملتے چوں می شود توحید مست
قوت و جبروت می آید بدست

---

(۹) ایک غلط خیال مسلمانوں میں یہ راسخ ہو چکا تھا کہ مذہبی امور

میں تحقیق و تدقیق اور فکر و نظر کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور نجات کیلئے بزرگانِ سلف کی کورانہ تقلید کرنا کافی ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے مسلمان آج چودھویں صدی میں بھی چوتھی صدی ہجری کا وضع کیا ہوا پروگرام اپنے سامنے رکھتے ہیں اور خیالات کے لحاظ سے پورے ایک ہزار سال پیچھے ہیں مسلمانوں کے اسی غلط خیال کی وجہ سے بعض دشمنانِ اسلام مثلاً میور زویمر وغیرہ کو اس اعتراض کا موقع ملا کہ اسلام ایک جامد نظامِ حیات ہے اور اس لئے بنی نوع آدم کی ترقی کی راہ میں ایک سنگ گراں ہے۔

علامہ نے اپنی نظموں میں اور خصوصاً اپنے غیر فانی "مدراس لکچرز" میں اس غلط خیال کی تردید فرمائی اور مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ اسلام چونکہ خاتم الادیان ہے اس لئے منطقی طور پر ضروری ہے کہ اجتہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا رہے۔ اور اسلامی نظام کو صفتِ دوام اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ اسلامی قوانین کی توجیہہ ہر زمانہ میں حالات کے مطابق کی جائے اور بلا شبہ اگر یہ بات نہ ہو یعنی اگر ہر زمانے کے مفکرین کو نئے مسائل کا حل دریافت کرنے کی اجازت نہ ہو تو ختم نبوت کا اصول برقرار نہیں رہ سکتا۔

لیکن اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر شخص اور "ہر شیخ مکتب" خواہ وہ کم سواد و کم نظر ہی

کیوں نہ ہو اجتہاد کر سکتا ہے علامہ نے جس چیز سے مسلمانوں کو منع کیا ہے وہ کورانہ تقلید ہے خصوصاً فقہی معاملات میں لیکن بزرگان سلف کے اسلامی اصولوں کی تقلید کو انھوں نے زمانہ انحطاط میں "اولی تر" قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ۔ ؎

زاجتہاد عالمان کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
راہِ آباد رو کہ این جمعیت است معنی تقلید ضبط ملت است

الغرض انھوں نے جس تقلید کا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ دین میں بدعات کا دروازہ نہ کھولا جائے اور ہمیشہ کتاب و سنت کی پیروی کی جائے۔ اِس کورانہ تقلید سے منع فرمایا ہے جس کی بدولت اسلام جامد نظام بن جاتا ہے۔ ؎

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن
امت مسلم ز آیات خدا است اصلش از ہنگامہ قالوا بلیٰ است
از اجل این قوم بے پرواستے استوار از نحن نزلنا ستے

اب یہ صاف ظاہر ہے کہ ملت اسلامیہ اجل سے اسی حالت میں بے پرواہ ہو سکتی ہے جب در اجتہاد باز رکھا جائے تاکہ اس کی بدولت اسلام انسانی معاشرت کے ارتقا سے ہمنوائی کرنے کے قابل ہو سکے۔

---

(۱۰) ایک غلط خیال مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا کہ خدا خودی کے مٹانے اور فنا کر دینے سے ملتا ہے اس خیال کا سرچشمہ ہی ہنود کے ساتھ ارتباط و اختلاط ہے جس کی بنیاد اکبر نے رکھی اور دارا شکوہ نے اس کو تقویت دی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے اپنی ہستی کو ذلیل و خوار قرار دے دیا اور جو مجد و شرف اللہ نے انسان کو عطا فرمایا تھا اس سے برضا خود دستبردار ہو گئے۔

علامہ نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ انسان کا مقصد حیات یہ نہیں کہ اپنی خودی کو مٹا دے بلکہ وہ تو "خلیفۃ اللہ" ہے اور انسانیت کا مقام اس قدر بلند ہے کہ :-

متاعِ بے بہا ہے سوز و سازِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب　　ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

افرنگ ز خود بے خبرت کرد، وگرنہ　　اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

خودی جس کی ہوئی پہلے نمودار　　وہی مہدی وہی آخر زمانی

منکرِ حق نزدِ ملّا کافر است　　منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں　　تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے　　جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل　　یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں　　باقی ہے نمودِ سیمیائی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت　　یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش　　جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں   مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں   جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر   طلسمِ زمان و مکان توڑ کر

خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید   زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار   کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

ان اشعار سے ثابت ہو گیا کہ خودی مٹانے کی چیز نہیں بلکہ فروغ دینے کی چیز ہے جو شخص وصال کا آرزو مند ہو اُسے چاہئے کہ اپنی خودی کو مستحکم کرے۔

حیاتِ خودی کے نتائج

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی   نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب   خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

تنبیہات

چونکہ علامہ کو اللہ نے اس صدی میں فراست ایمانی سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا اس لئے انہوں نے دعوت اسلام اور اصلاح عقائد کے علاوہ ایک اور احسان بھی مسلمانوں پر ارزانی فرمایا اور میرا یہ خیال ہے کہ اس احسان ہی کی وجہ سے ان کا مرتبہ دنیائے اسلام میں اس قدر بلند ہو گیا ہے۔ آنے والی نسلیں انہیں مصلح امت کے علاوہ محسن قوم کی حیثیت سے بھی یاد کریں گی۔ انہوں نے کمال دانائی اور خوبی کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کی خاطر گردو پیش اور عصر حاضر کے ان تمام مسائل کا اسلامی روشنی میں صحیح حل پیش کر دیا ہے اور ان تمام تحریکات کی حقیقت آشکار کر دی ہے جو اس وقت مسلمانوں کے سامنے ہیں اور ان کی حیات اجتماعی پر اثر انداز ہونے والی ہیں۔ جب میں اس حقیقت پر غور کرتا ہوں کہ علامہ نے کیسی خوبی کے ساتھ ان تمام امور میں امت اسلامیہ کی صحیح راہنمائی فرمائی ہے تو بے اختیار تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ علامہ اس عہد ہی کے سب سے بڑے مفکر نہ تھے بلکہ گزشتہ سات صدیوں میں ان کی کوئی نظیر،

اسلامی دنیا میں نظر نہیں آتی۔

اگرچہ موجودہ دور، دورالحاد و فتن ہے لیکن اس مردِ خود آگاہ نے تمام فتنوں کا ایک ایک کرکے جائزہ لیا اور مسلمانوں کو بروقت متنبہ کر دیا کہ خبردار "دامِ ہمرنگ زمین" میں گرفتار نہ ہو جانا ذیل میں چھ فتنوں کا مختصر طور پر ذکر کرتا ہوں۔

وطنیت[1] ۔ جمہوریت[2] ۔ اشتراکیت[3] ۔ ملوکیت[4] ۔ سرمایہ داری[5]

اور تہذیبِ مغرب[6] ۔

---

(۱) تحریک وطنیت | مجھے افسوس ہے کہ طوالت کے خوف سے اس تحریک کے مالہٗ و ماعلیہ پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کر سکتا بس یہ سمجھ لیجئے کہ نتائج کے لحاظ سے یہ تحریک مسلمانوں کے حق میں سب سے زیادہ خطرناک ہے وطنیت مذہب کی اور اس لئے اسلام کی نفی کرتی ہے اور اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ علاوہ بریں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان علماء بھی اس فتنہ کا شکار ہوئے ہیں اور اپنے خداوندانِ مجازی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صاف لفظوں میں فرماتے ہیں کہ "موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں" تو اس فتنہ کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں بعض مسلمان علماء جس غیر اسلامی مسلک کی طرف آج مائل نظر آتے ہیں حکیم الامت، مصلح قوم، علامہ اقبال مرحوم نے آج سے بیس سال پہلے اس مسلک کے اندر جو کفر و الحاد اور بے دینی کا فتنہ پوشیدہ ہے اسے دیکھ لیا تھا اور اس کے مفاسد کا اندازہ کر کے مسلمانوں کو ان الفاظ میں متنبہ فرما دیا تھا ؎

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے — غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے — اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

وطنیت کے مفاسد اس طور سے بیان فرمائے ہیں :-

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے — کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس تنبیہ کی وجہ یہ ہے کہ وطن دوستی اور وطن پروری اور چیز اور وطنیت یا وطن پرستی اور چیز ہے۔ وطن سے محبت رکھنا اور وطن کی خدمت کرنا نہ جرم ہے نہ خلاف اسلام لیکن موجودہ زمانہ میں یہ تحریک مذہب کی مدمقابل اور مذہب اسلام کے تصورات اساسی سے متصادم ہے

اس لیے مسلمان کے لیے لائق قبول نہیں ہو سکتی۔ وہ خدا پرست ہے نہ کہ وطن پرست۔

علامہ کی نگاہ میں یہ فتنہ جس درجہ خطرناک ہے اس کا اندازہ آپ کو اس شعر سے ہو سکتا ہے:

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانہ میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

چونکہ یہ تحریک باطل پرستارانِ مغرب کے دماغوں کی شرمندۂ احسان ہے اس لیے مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا لازم ہے

لردِ مغرب آں سراپا مکر و فن
اہل دیں را داد تعلیم وطن
تو اگر داری تمیز خوب و زشت
دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت

وطنیت کی تحریک منافی اخوت ہے اس لیے مردود ہے

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انساں را قبائل ساختند
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

اسلام کا مقصود کیا ہے؟ اس کو علامہ ہی کی زبان سے سنئے ؎

تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکہ نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام　　جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

وطنیت اور قومیت کے متعلق خود علامہ کا بیان ان کے خطبہ صدارت سے اخذ کر کے ناظرین کی بصیرت کے لئے پیش کرتا ہوں ؎

خطبہ صدارت مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور ۱۹۳۲ء میں فرماتے ہیں:-

"میں یورپ کے پیش کردہ نیشنلزم کا مخالف ہوں۔ اس لئے کہ مجھے اس تحریک میں مادیت اور الحاد کے جراثیم نظر آتے ہیں اور یہ جراثیم میرے نزدیک دور حاضر کی انسانیت کے لئے شدید ترین خطرات کا سرچشمہ ہیں۔ اگرچہ حب وطن ایک فطری امر ہے اور اس لئے انسان کی اخلاقی زندگی کا ایک جز ہے۔ لیکن جو شے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب اور اس کا کلچر اور اس کی ملی روایات ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لئے انسانوں کو زندہ رہنا چاہئے اور جن کی خاطر انہیں اپنی جان قربان کرنی چاہئے۔ وہ خطہ زمین جس میں وہ رہتا ہے اور جس سے ساتھ عارضی طور پر اس کی روح وابستہ ہوتی ہے اس لائق نہیں کہ اسے خدا اور مذہب سے برتر قرار دیا جائے۔"

---

۹ - دینی غیرت

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ قوم از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

---

۱۰ - جمہوریت

اس زمانہ میں جمہوریت کا بھی بہت چرچا ہے اور ہندی مسلمان وطنیت کی طرح مغربی جمہوریت کے اصول سے بھی متاثر ہو رہا ہے۔ اس لئے علامہ نے یوں الفاظ متنبہ فرمایا ہے۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ — مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ

گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ　　من بجز عبرت نگیرم از فرنگ

علامہ کی نظر میں یورپ کا جمہوری نظام بھی استبداد اور غلبہ عام کی ایک نئی شکل ہے دگر ہیچ۔ ان کو سب سے بڑی شکایت اس طرز حکومت سے خلافت یہ ہے کہ اس میں قابلیت کو معیار حکومت نہیں بنایا جاتا۔ اگر ایک نااہل آدمی مختلف ذرائع سے اقتدار حاصل کرلے تو وہ برسر حکومت آسکتا ہے۔ علاوہ بریں جمہوریت مغرب گروہ بندی اور فرقہ پرستی کو تقویت دیتی ہے۔ اور اس کی بنا پر مختلف طبقات میں تصادم ہوتا ہے جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ انسانیت کی ترقی میں روکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ گلشن راز جدید میں علامہ نے اشعار ذیل میں انہی مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے: ؎

فرنگ آئین جمہوری نہاد است　　رسن از گردن دیوے کشاد است

زباغش کشت ویرانے نکوتر　　زشہر او بیابانے نکوتر

چو رہزن کاروانے در تگ و تاز　　شکمہا بہر نانے در تگ و تاز

روان خوابید و تن بیدار گردید — هنر با دین و دانش خوار گردید

خرد جز کافری کافرگری نیست — فن افرنگ جز مردم دری نیست

گروهے را گروهے در کمین است — خدایش یار اگر کارش چنین است

زمن دہ اہل مغرب را پیامے — کہ جمہور است تیغ بے نیامے
چہ شمشیرے کہ جانہا می ستاند
تمیز مسلم و کافر نہ داند

---

۶ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء کو جب میں نے یہ شعر پڑھے تو علامہ نے ان کی تشریح کے سلسلہ میں یہ ارشاد فرمایا تھا :-

"جمہوریت کے ساتھ امامت کا تصور بھی ضروری ہے اہل فرنگ کا مسلک تو یہ ہے کہ جمہوریت کی پیروی کرو اور میرا مسلک یہ ہے کہ "مرد کامل" کی پیروی کرو۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

۳۔ ملوکیت | چونکہ ملوکیت سراسر اسلام کی رُوح کے خلاف ہے اس لیے علامہ نے اس اصول کی بڑے زور سے مذمت فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ملوکیت کا مقصد رعایا کا خون چوسنا اور ظلم و ستم کرنا ہے: ؎

ہم ملوکیت بدن را فربہی است　　سینۂ بے نور او از دل تہی است
مثل زنبورے کہ بر گل می چرد　　برگ را بگذارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں　　بر جمالش نالۂ بلبل ہماں

مرگ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گل مخواں او را کہ در باطن گل است

حکومت صرف ذات باری کو زیبا ہے دنیاوی حکومت تو بنی نوع آدم کے حق میں لعنت ہے۔

زیر گردوں آمری از قاہری است　　آمری از ماسوی اللہ کافری است
حاصل آئین و دستور ملوک؟　　دہ خدایان فربہ و دہقان چو دوک

باطن الارض للہ ظاہر است
ہر کہ ایں باطن نہ بیند کافر است

قرآن کی تعلیم ملوکیت کے خلاف ہے ؎

منزل و مقصود قرآں دیگر است　　رسم و آئین مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست　　مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست   خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

ملوکیت کا مقصد کیا ہے؟ غور سے پڑھئے ۔

چیست تقدیرِ ملوکیت؟ شقاق   محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق

جب تک حکومت کی بنیاد تقویٰ اور آئینِ الٰہیہ پر نہ ہو اسلام اسے جائز قرار نہیں دے سکتا۔

حاکمی بے نورِ جاں خام است خام   بے ید بیضا ملوکیت حرام

اسلام میں حکمرانی کا مفہوم کیا ہے؟ سنئے ۔

سروری در دینِ ما خدمت گری است   عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است
آں مسلماناں کہ میری کردہ اند   در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در ہجومِ کارہائے ملک و دیں   با دلِ خود یک نفس خلوت گزیں
ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

یہ تو معلوم ہو گیا کہ اسلامی فرمانروا کے لئے عشقِ مصطفیٰ لازمی ہے اب یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ اس عشق کی صفت کیا ہے؟

روح را جز عشق او آرام نیست   عشق او روزیست کو را شام نیست

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ عشقِ مصطفیٰ انسان کو غیر فانی بنا دیتا ہے۔ اور حیاتِ جاودانی عطا کر دیتا ہے۔

۴۔ اشتراکیت | اشتراکیت کا بانی کارل مارکس تھا جس نے کتاب "سرمایہ" لکھی تھی۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل ۔۔۔ یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است ۔۔۔ قلبِ او مومن دماغش کافر است

اس شخص سے متعلق، علامہ اقبال کا خیال ہے کہ اگرچہ اس کی تعلیم غلط ہے مگر اس میں صداقت کا عنصر بھی موجود ہے۔

اشتراکیت کا روشن پہلو (عنصرِ صداقت) اس کا اصول مساوات ہے لیکن مارکس نے صرف حضرتِ انسان کے جسمانی پہلو کو لیا، روحانیت کو چھوڑ دیا۔ اس لئے

غربیاں گم کردہ اند افلاک را ۔۔۔ در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک ۔۔۔ جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

ملوکیت اور اشتراکیت دونوں کی خرابیاں بیان فرمائی ہیں

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل

علامہ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ سوشلزم میں دو ایک خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اسکی بنیاد مادیت پر ہے اس لئے یہ نظام سوسائٹی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لا سلاطیں لا کلیسا لا الٰہ

لیکن روح انسانی لا سے تسلی نہیں پا سکتی ؎

در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے الّا می خرامد کائنات

بنی نوع آدم کے لئے صرف اسلامی نظام ہی قابل اتباع ہے جس میں سوشلزم کی تمام خوبیاں تو موجود ہیں مگر وہ ان نقائص سے بالکل پاک ہے جو اس میں پائے جاتے ہیں یعنی اسلام انسان کے جسم کے علاوہ اس کی روح کی آبیاری بھی کرتا ہے۔

۵۔ سرمایہ داری | سرمایہ داری کے مفاسد، آج کل اس درجہ نمایاں

ہو گئے ہیں کہ اس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑا انصادم سرمایہ داری اور مزدوری کے مابین رونما ہو رہا ہے۔ علامہ نے اس دشمن انسانیت مسلک کے مفاسد باین انداز بیان فرمائے ہیں۔

(۱) سرمایہ دار بنی نوع آدم کا دشمن ہے ؎

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شدہ است
آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شدہ است

(۲) سرمایہ دار کی ذہنیت اور اس کا طریق کار یہ ہے ؎

این خاک و آنچہ در شکم او از آنِ من
و ز خاک تا بہ عرش معلے از آنِ تو

(۳) علامہ نے مزدور کی حمایت میں بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے ؎

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
زخونِ من چو زلو، فربہی کلیسا را
بزور بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

(۴) مزدور کو اس طرح تنبیہ فرماتی ہے ؎

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تاکے؟
زخویش این ہمہ بیگانہ زیستن تاکے؟

(۵) اسلام مزدور کا حامی ہے اس لئے علامہ بھی اس طرح اس کی حمایت کا حق ادا فرماتے ہیں۔

(اللہ تعالیٰ ملائکہ سے خطاب فرماتا ہے)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روٹی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

علامہ نے بالِ جبریل میں پنجاب کے دہقان سے جو خطاب کیا ہے
وہ ان کے زاویۂ نگاہ کو بخوبی ظاہر کر سکتا ہے ؎

اسی خاک میں دب گئی تیری آگ — سحر کی اذاں ہو گئی اب تو جاگ
زمانہ میں جھوٹا ہے اس کا نگیں — جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ — رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم یہی فتحِ باب — کہ دنیا میں توحید ہو بے نقاب

بخاک بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں

---

(۱) تہذیبِ مغرب | تہذیبِ مغرب کا ایک جامع اصطلاح ہے اور اس کے

دائرہ میں مغربی تمدن اور معاشرت کے علاوہ مغربی خیالات و افکار، طرزِ فکر، اصولِ معاشرت، ضابطۂ اخلاق اور مادہ پرستی سب کچھ شامل ہے۔ اس تہذیب کی بنیاد لادینی اور الحاد اور مادہ پرستی پر قائم ہے۔ اس لئے علامہ جو اس دورِ مادیت میں مذہب اور روحانیت کے سب سے بڑے وکیل ہیں اس مغربی تہذیب سے سخت بیزار ہیں اور انہوں نے مختلف طریقوں سے اس کی مذمت کی ہے۔

نگہ کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

قدحے خرد فروزے کہ فرنگ داد ما را   ہمہ آفتاب لیکن اثرِ سحر ندارد

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ؟   در جہانِ او دو صد فردوس رنگ

ظاہرش تابندہ و گیرندہ ایست   دل ضعیف است نگہ را بندہ ایست

مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟ دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات!

اس فتنہ سے محفوظ رہنے کا طریقہ بھی سن لیجئے ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

علامہ تہذیب مغرب کو مسلمانوں کے لئے جس قدر مضرت رساں
خیال فرماتے ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے ؎

آب حیوان از دم خنجر طلب از دہان اژدہا کوثر طلب
سنگ اسود از در بتخانہ خواہ نافۂ مشک از سگ دیوانہ خواہ
سوز عشق از دانش حاضر مجو کیف حق از جام این کافر مجو

فرماتے ہیں کہ میں نے اس تہذیب کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے

ہدایات

علامہ کو چونکہ اللہ نے نور معرفت اور علم [illegible] عطا فرمایا تھا۔ اسلئے انہوں نے مسلمانوں کی ہدایات کے لئے ایسی عمدہ نصائح قلمبند فرمائی ہیں کہ وہ زندگی میں کامیابی کی ضامن ہیں اور اگر ان پر عمل کیا جائے تو حکومت ان کے قدم چوم سکتی ہے نیز انہوں نے ان تمام سوالات اور مسائل کا تسلی بخش حل بھی پیش کر دیا ہے جن سے ہم اس وقت دوچار ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان ہدایات کو مدنظر رکھ کر ان کے کلام کا مطالعہ کرے تو وہ اس بات کے اعتراف پر مجبور ہوگا کہ بلاشبہ اللہ نے علامہ مرحوم کو اس صدی میں مسلمانان عالم کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ہی پیدا کیا تھا۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی ایسا سوال یا کوئی ایسا مسئلہ آپ کے دماغ میں پیدا نہیں ہو سکتا جس کا جواب یا حل علامہ کے کلام میں موجود نہ ہو اور انداز بیان اس [illegible] اور حکیمانہ ہے کہ انسان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

میں اس کتاب میں فلسفیانہ مسائل [illegible] کروں گا کیونکہ

اس سے متعلق ایک جداگانہ کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔ بلکہ مسائل حاضرہ اور امورِ عامہ میں جو ہدایت علامہ نے دی ہے صرف اس کا اختصار کے ساتھ اس جگہ ذکر کروں گا۔

۱۔ حفظ خودی | "خودی" یہ تو علامہ کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد ان کی تمام شاعری اور ان کا تمام تخیل اور ان کی تمام فکر گردش کرتی ہے۔ اس جگہ خودی کا فلسفہ لکھنا مقصود نہیں بلکہ یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ علامہ نے مسلمانوں کو بار بار ہدایت فرمائی ہے کہ اپنی خودی کی حفاظت کرو۔ اگر خودی کی طرف سے غافل ہو جاؤ گے تو مٹ جاؤ گے۔ اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے　　جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی! کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

خودی کے نگہبان کو ہے زہر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

[illegible] ہے لائق احترام کہ ہو جس سے [illegible]

---

(۲) عشق کی قدر و منزلت | علامہ کی نظر میں عشق کو [illegible] کی حیثیت [illegible]

ہے اور حیات انسانی کی تکمیل کے لیے اشد ضروری چیز ہے۔ چنانچہ انہوں نے جو خط ولایت سے جاوید سلمہ کو بھیجا تھا اس میں پہلی نصیحت اپنے لخت جگر کو یہ فرمائی کہ ؎

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علامہ کی نگاہ میں عشق کا مرتبہ کیا ہے۔

خودی کی طرح عشق پر بھی جداگانہ کتاب لکھنے کا ارادہ ہے اس جگہ صرف اتنی صراحت کرنی چاہتا ہوں کہ علامہؒ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی زندگی کی بنیاد عقل کے بجائے عشق پر رکھیں کیونکہ ؎

نہ رہا باقی نہ وہ یاری جلتا ہے رومیؒ ہارا ہے رازیؒ

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

عقل ناقص اور محدود ہے رہنمائی کا فرض انجام نہیں دے سکتی لیکن عشق حقیقی رہنما ہے اور انسان کو اس کی اصلی منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ عقل کا پیرو چون وچرا کی پیچدار گلیوں میں بھٹکتا رہتا ہے لیکن عشق کا پیرو بڑی آسانی کے ساتھ فائز المرام ہو جاتا ہے۔ عشق کی توفیق لامحدود ہیں اور اس کی بدولت ذرۂ بے مقدار آفتاب عالمتاب سے ہم آغوش ہو

سکتا ہے حضور سرور کائنات نے اسی کی بدولت چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔

عشق کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ علامہ عشق کو معیار ایمان قرار دیتے ہیں۔ ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

اب میں چند اشعار لکھتا ہوں جن سے عشق کے مرتبہ پر مزید روشنی پڑے گی:۔

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

عشق شبخونے زدن بر لامکاں
گور را نادیدہ رفتن از جہاں

عشق با نان جویں خیبر کشاد
عشق در اندام مہ چاکے نہاد

عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است
کار او از دین و دانش برتر است

عشق سلطان است و برہان مبین   ہر دو عالم عشق را زیر نگین
چوں خودی را از خدا طالب شود
جملہ عالم مرکب او راکب شود

---

(۳) حیات ابدی کا راز
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی   یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے
(۴) غلامی ایسی لعنت ہے کہ ضمیر تک کو بدل دیتی ہے۔
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا   کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
(۵) وحدتِ عمل کے بغیر وحدت فکر حاصل نہیں ہو سکتی۔
آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام
(۶) جب تک دل اور نگاہ بھی مسلمان نہ ہو مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا۔
خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل؟   دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(۷) وجود انسانی کی حقیقت۔
وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود   کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا
(۸) معیار صداقت فلسفہ

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار   جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

(۹) کافر اور مومن کی شناخت۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے   مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(۱۰) حیات کا مفہوم

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی است   لا و الا از مقاماتِ خودی است

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا   حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

(۱۱) حقیقی امام کون ہے؟ معیارِ امامت کیا ہے؟

ہے وہی تیرے زمانہ کا امامِ برحق   جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے   فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اسکی

جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

(۱۲) معیارِ نبوت (خصوصاً اہلِ پنجاب کے لئے)

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش   جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

(۱۳) دردِ دل کی قیمت

پرِ عقل فلک پیما ترکانہ شبیخونے   یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطون

(۱۴) صفتِ بندۂ آزاد

ہم کو ہو پیروں کی کرامات کا سودا   ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

(۱۵) خوش نصیب کون ہے؟

خوشا کسیکہ بہ دنبال محمل است ہنوز — تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد

(۱۶) سینہ میں کون سا دل درکار ہے؟

بدہ آں دل بدہ آں دل کہ گیتی را فرا گیرد
بگیر ایں دل بگیر ایں دل کہ در بند کم و بیش است

(۱۷) معیار علوم و فنون ہے

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

(۱۸) صرف نگاہ شوق معیار شرف ہے۔

نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو — ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

(۱۹) قوت ہی حقیقی جمال ہے

مرے لئے ہے فقط زور حیدری کافی — ترے نصیب فلاطوں کی تیزی ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی — کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

(۲۰) معیار شاعری

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے — آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

بہترین سپاہی یا مغنی یا بہترین مصور وہ ہے جس کے آرٹ سے اس کی خودی کا اظہار ہوتا ہو۔

(۲۱) معیار موسیقی

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام　　حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

(۲۲) معیار شاعری

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے

(۲۳) حقیقت شعر

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے　　یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

(۲۴) رقص روح کا نتیجہ۔

چھوڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی
رقص تن در گردش آرد خاک را
رقص جاں برہم زند افلاک را

(۲۵) معیار ایمان :-

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد این دو جوہر کافر است

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

(۲۶) فیضانِ نبوت یا نبی کی شناخت

من نمی دانم چہ افسوں می کند
رُوح را در تن دگرگوں می کند

بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز
ہر کہن معبود را کن ریز ریز

(۲۷) عافیت کا سرچشمہ کہاں ہے؟

فقر خواہی از تہی دستی منال
عافیت در حالِ شُنے در جاہ و مال

(۲۸) جھوٹے نبی کی پہچان

مکتب از تدبیرِ او گیرد نظام
تا بکام خواجہ اندیشد غلام

شیخِ ملت با حدیثِ دلنشیں
بر مرادِ او کند تجدیدِ دیں

(۲۹) لادینی حکومت کے ثمرات یعنی محکوم اقوام کی حالت

وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر
کارِ او تخریبِ خود تعمیرِ غیر

می شود در علم و فن صاحب نظر
از وجودِ خود نگردد با خبر

بے نصیب آمد ز اولادِ غیور
جاں بہ تن چوں مردہ در خاکِ گور

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن
نوجوانان چوں زناں مشغولِ تن

دخترانِ او بزلفِ خود اسیر
شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر

(۳۰) محکوم کا معبود اور دین

قوت فرمانروا معبودِ او — در زیانِ دین و ایمان سودِ او
دینِ او عهدِ وفا بستن بغیر — یعنی از خشتِ حرم تعمیرِ دیر

(۳۱) حصولِ آزادی کا نسخه

تا نه رمزِ لا اله آید بدست — بندِ غیر الله را نتوان شکست

(۳۲) معنیٔ توحید

لا و الا احتسابِ کائنات — لا و الا فتحِ بابِ کائنات
هر دو تقدیرِ جهانِ کاف و نون — حرکت از لا زاید از الا سکون

هر که اندر دستِ او شمشیرِ لاست
جمله موجودات را فرمانرواست

(۳۳) معنیٔ فقر

فقر کارِ خویش را سنجیدن است — بر دو حرفِ لا اله پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر — بستهٔ فتراکِ او سلطان و میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم این متاعِ مصطفیٰ است

(۳۴) صفتِ مردِ فقیر

با سلاطین در فتد مردِ فقیر — از شکوهِ بوریا لرزد سریر
قلبِ او را قوت از جذب و سلوک — پیشِ سلطان نعرهٔ او "لا ملوک"

(۳۵) صفت فقرِ مومن

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ او مولا صفات
فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است — فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است

فقرِ عُریاں گرمیٔ بدر و حنین
فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین

(۳۶) ہندی مسلمان کے شیوخ کی کیفیت :-

شیخِ او مردِ فرنگی را مرید — گرچہ گوید از مقامِ بایزید
گفت دین را رونق از محکومی است — زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مرد

(۳۷) مردِ حر کی صفت اور شناخت

مردِ حُر از لا الہ روشن ضمیر — می نگردد گردِ سلطان و امیر
پادشاہاں در قباہائے حریر — زرد رُو از سہمِ آں عریاں فقیر
با کلیسا دوست با مسجد فروش — او ز دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش

ما ہمہ عبدِ فرنگ او عبدہٗ
او نہ گنجد در جہانِ چار سُو

(۳۸) معنی و مقصود شریعت

شرع برخیزد ز اعماقِ حیات — روشن از نورش ظلامِ کائنات
حکمش از عدل است و تسلیم و رضاست — بیخ او اندر ضمیرِ مصطفیٰ است
مصطفیٰ داد از رضائے او خبر — نیست در احکامِ دیں چیزے دگر

تختِ جم پوشیدہ زیرِ بوریاست
فقر و شاہی از مقاماتِ رضاست

(۳۹) معنیٔ طریقت۔

پس طریقت چیست اے والا صفات — شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات
گر نہ بینی دین تو مجبوری است — ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

بندہ تا حق را نہ بیند آشکار
برنمی آید ز جبر و اختیار

(۴۰) نتائج و کیفیتِ غلامی

از غلامی لذتِ ایماں مجو — گرچہ باشد حافظِ قرآں، مجو
از غلامی رُوح میرد در بدن — از غلامی رُوح گردد بارِ تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد — ایں و آں با ایں و آں اندر نبرد
از غلامی مردِ حق زنّار بند — از غلامی گوہرش ناارجمند
کورِ ذوق و نیش را دانستہ نوش — مردہ بے مرگ و نعشِ خود بدوش
آبروئے زندگی در باختہ — چوں خراں با کاہ و جو در ساختہ

ہر زباں ترسد غلام از بیم مرگ
زندگی او را حرام از بیم مرگ

(۴۱) قوت کا منبع کہاں ہے

اہل حق را زندگی از قوت است — قوت ہر ملت از جمعیت است
مردۂ از یک نگاہے زندہ شو — بگذر از بے مرکزی پائندہ شو

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرد از توحید لاہوتی شود — ملت از توحید جبروتی شود

ہر دو از توحید می گیرد کمال
زندگی ایں را جلال آں را جمال

(۴۲) معنیٔ ملت

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ؟ — با ہزاراں چشم بودن یک نگہ
ملتے چوں می شود توحید مست — قوت و جبروت می آید بدست

(۴۳) دین کا سرچشمہ کہاں ہے؟

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر — علم و حکمت از کتب دیں از نظر

(۴۴) عشق کا منبع کہاں ہے؟

می ندانی عشق و مستی از کجا است — ایں شعاع آفتاب مصطفےٰ است

(۴۵) معنی کرّاری

می شناسی معنی کرار چیست — ایں مقامے از مقامات علی است

امتاں را در جہان بے ثبات — نیست ممکن جز بکرّاری حیات

مسلم ہندی چرا میداں گذاشت

ہمت او بوئے کرّاری نداشت

(۴۶) حیات کی حقیقت

آنکہ حیؑ لا یموت آمد حق است — زیستن با حق حیات مطلق است

ہرکہ بے حق زیست جز مردار نیست — گرچہ کس در ماتم او زار نیست

(۴۷) حقیقت ابدی کیا ہے ؟

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری — بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

(یعنی مقام شبیری وہ حقیقت ہے جو کبھی بدلتی نہیں)

(۴۸) مسئلہ جبر و قدر

ہرکہ از تقدیر دارد ساز و برگ — لرزد از نیروے او ابلیس و مرگ

جبر خالدؓ عالمے برہم کند — جبر ما بیخ و بن ما بر کند

معنئ تقدیر کم فہمیدۂ — نے خدا را نے خودی را دیدۂ

مرد مومن با خدا دارد نیاز

با تو ما سازیم تو با ما بساز

(۴۹) زندگی کا مفہوم

زندہ؟ مشتاق شو خلاق شو — ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو
ہر کہ او را قوت تخلیق نیست — نزد ما جز کافر و زندیق نیست

(۵۰) جنگ مومن

جنگ شاہان جہان غارت گری است — جنگ مومن سنت پیغمبری است
جنگ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست — ترک عالم اختیار کوئے دوست

(۵۱) مقام آدم

آنچہ در عالم نگنجد عالم است — آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آشکارا مہر و مہ در جلوتش — نیست رہ جبریل را در خلوتش

(۵۲) مقصد شریعت

کس نگردد در جہاں محتاج کس — نکتۂ شرع مبیں این است و بس

(۵۳) حقیقت شکست

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

(۵۴) نماز کی حقیقت

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۵۵) ملت کی زندگی کا راز

زندہ ہے فقط وحدت افکار سے ملت — وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

(۵۶) معیارِ زشتی و خوبی

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل — جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

(۵۷) ساحری اور پیغمبری میں فرق

دلبری بے قاہری جادوگری است — دلبری با قاہری پیغمبری است

(۵۸) معیارِ عاشقی

عاشقی؟ توحید را بر دل زدن — وانگہے خود را بہر مشکل زدن

(۵۹) معنیٔ حیاتِ دوام

تو نشناسی ہنوز، شوق بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

(۶۰) فلسفہ اور شاعری میں فرق

حق اگر سوزے ندارد حکمت است — شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

(۶۱) فلسفی اور سیاست داں میں فرق۔

آں تراشد قولِ حق را حجتے نا استوار — ویں تراشد قولِ باطل را دلیلِ محکمے

(۶۲) مقامِ بندگی کی قدر و قیمت

متاعِ بے بہا ہے سوز و سازِ آرزومندی — مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

(۶۳) فیضانِ نظر اور تعلیمِ مکتب کا موازنہ

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی — سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

(۶۴) فقر و سلطنت میں امتیاز

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا　　یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نظر کی تیغ بازی

(۶۵) رازق کی شناخت کا نتیجہ

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک　　اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

(۶۶) دل اور شکم کا موازنہ

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت

فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

(۶۷) من اور تن کی دنیا کا فرق

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق

تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

(۶۸) مقام مرگ و عشق کا راز

کھول کے کیا بیاں کروں سر مقام مرگ و عشق

عشق ہے مرگ با شرف مرگ حیات بے شرف

(۶۹) حکیم اور کلیم میں فرق

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

(۷۰) مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ -

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ؟

(۷۱) تقدیرِ امم کیا ہے؟

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

(۷۲) خودی کی بلندی کا معیار

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(۷۳) یقین پیدا کرنے کا نتیجہ

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

(۷۴) داستانِ حرم

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیل

(۷۵) عصرِ حاضر کا فیضان

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بیباک!

(۷۶) انسان کا جہان کونسا ہے؟

ترا جہاں ہے وہی جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

(۷۷) فلسفی اور ملا کی حقیقت

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

(۷۸) عصا کے بغیر کلیمی کا انجام

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

(۷۹) فہم کتاب کا طریق

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

(۸۰) کمال و زوال عشق کا نتیجہ

کمال عشق و مستی ظرف حیدر   زوال عشق و مستی حرف رازی

(۸۱) فرنگی تمدن کے نتائج

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟

(۸۲) بادشاہت کا گُر

تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

(۸۳) دین سے عشق کا انجام (عشق کے بغیر دین کی کوئی قیمت نہیں ہے)

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

(۸۴) معراج مسلمانی کہاں ہے؟

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

(۸۵) مذہب ملا و مومن

وہ وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یہ خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

(۸۶) ملا کی خوش فہمی

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

(۸۷)

لذتِ پرواز کس کا حق ہے؟

جہاں میں لذت پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذب خاک سے آزاد

(۸۸) قومی عزت کی بقاء کا راز

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

(۸۹) دنیا کو کیسے مہدی کی ضرورت ہے؟

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

(۹۰) عالم عربی کے حدود (عالم عربی جغرافیائی حدود سے محدود نہیں ہے)

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

(۹۱) مومن کی حقیقت

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

(۹۲)

موازنۂ علم و حیات

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

(۹۳) ضعیف قوموں کا علاج

لادینی و لاطینی! کس پیچ میں الجھا تو؟
دارو ہے ضعیفوں کی لَا غَالِبَ اِلَّا هُوْ

(۹۴) آدمیت کیا ہے؟

آدمیت؟ احترامِ آدمی   باخبر شو از مقامِ آدمی

(۹۵) دین کی حقیقت کیا ہے؟

دین، سراپا سوختن اندر طلب
انتہائیش عشق و آغازش ادب

(۹۶) سِرّ دین کیا ہے؟

سِرّ دین، صدقِ مقال اکلِ حلال
خلوت و جلوت تماشائے جمال

(۹۷) علم کیا ہے؟

علم جز شرحِ مقاماتِ تو نیست   علم جز تفسیرِ آیاتِ تو نیست

(۹۸) علم حق کیا ہے۔

علمِ حق اول حواس آخر حضور   آخرِ او می نہ گنجد در شعور

(۹۹) حکمرانی کے حصول کا طریقہ

وحدتِ افکار و کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں

(۱۰۰) ملّت کی حقیقت کیا ہے؟

قوّتِ دیں از مقامِ وحدت است
وحدت ار مشہود گردد ملت است

(۱۰۱) شرطِ اسلام کیا ہے؟

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے گر مسلمانی نیاسائی دمے

میں نے علامہ کے اردو اور فارسی کلام سے، گذشتہ اوراق میں جو حقایق و معارف منتخب کرکے، ہدیۂ ناظرین کئے ہیں اگرچہ وہ مشتے بطور نمونہ از خروارے کا مصداق ہیں تاہم مجھے یقین ہے کہ ان کے مطالعہ سے علامہؒ کے مقام رفیع کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے لیکن دنیائے فکر میں ان کے مرتبہ و مقام کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اردو اور فارسی کلام کے علاوہ ان کے خطباتِ مدراس کا مطالعہ بھی کیا جائے جن کے متعلق خود علامہ مرحوم نے ۱۹۳۰ء میں راقم الحروف سے فرمایا تھا۔

"اگر یہ کتاب مامون الرشید کے عہد میں شائع ہوتی تو
بلاشبہ تمام دنیائے اسلام میں ایک ہیجان اور انسانی ذہنیت
میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا"

اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہوتی تو میں ضرور کوشش کروں گا کہ
مسلمان جواہرات کی اس کان سے بقدر ظرف اپنا اپنا دامن بھر لیں۔
میں جانتا ہوں کہ یہ کام بہت ہی دشوار ہے۔ مگر علامہؒ نے یہ فرما کر میرا
حوصلہ بندھا دیا ہے ؎

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

مخاطبات

دِل مردہ مومن میں پھر زندہ کر دے

وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے

نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

خطاب بہ فرزندانِ اسلام

خطاب بہ فرزندان اسلام | نوجوان، قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں اور اس کے مستقبل کا انحصار تمام تر انہی کی بیداری اور جانفشانی پر ہوتا ہے، اس لئے علامہ نے جاوید نامہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ ؎

برجواناں سہل کن حرفِ مرا
بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اسی محیر العقول کتاب کے آخر میں مجددِ عصرؒ نے نوجوانوں کو چند بیش قیمت نصائح فرمائی ہیں جو فی الحقیقت آبِ زر سے لکھے جانے اور حرزِ جان بنائے جانے کے لائق ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں نے اس کتاب میں صدہا حقائق و معارف علانیہ بیان کئے ہیں لیکن ایک نکتہ ایسا ہے کہ لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتا، لہذا ؎

سوز او را از نگاہِ من بگیر　　　سوختن در لا الٰہ از من بگیر

یعنی توحید کا سبق تو تیری ماں نے تجھے پڑھا دیا، لیکن توحید

کی آگ میں جلنا، یہ بات مجھ سے سیکھ لے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ؎

این دو حرف لا الٰہ گفتار نیست　　لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است　　لا الٰہ ضرب است و ضرب کاری است

کلمۂ توحید محض زبان سے ادا کرنے کی چیز نہیں ہے۔ جب تک توحید کی آگ سینہ میں روشن نہ ہو، عنصر بہیمیت فنا نہیں ہو سکتا، یعنی مسلمان وہ مرد مومن نہیں بن سکتا جس کی نگاہ سے تقدیریں پلٹ جاتی ہیں۔

پھر فرماتے ہیں کہ عصر حاضر نے ایران اور ہندوستان میں دو پیغمبر پیدا کئے ہیں۔ ان کی تعلیمات سے حذر کرنا واجب ہے کیونکہ ؎

آں ز حج بیگانہ وایں از جہاد

اور اگر حج اور جہاد ان دونوں اصولوں کو ترک کر دیا جائے تو پھر نماز اور روزہ، ان دونوں کی روح فنا ہو جائے گی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ؎

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام　　فرد ناہموار و ملت بے نظام

اس کے بعد نوجوانوں کو خطبات مدراس کے مطالعہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ مضمون میں خود انہی کے الفاظ میں بیان کروں گا۔

من بطبع عصر خود گفتم دو حرف　　کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف

حرف پیچا پیچ و حرفِ نیش دار | تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار
حرف نہ دارے باندازِ فرنگ | نالۂ مستانہ از تارِ چنگ
اصل ایں از ذکر و اصل آں زفکر | اے تو بادا وارثِ ایں فکر و ذکر

ان اشعار کا مطلب آسان لفظوں میں یہ ہے کہ :-

"میں نے عصرِ حاضر کی علمی ضروریات اور مذہبی اقتضاء کو مدِّنظر رکھ کر ایک کتاب لکھی ہے گویا سمندر کو دو کوزوں میں بند کر دیا ہے۔ اس کے مطالب بے شک مشکل ہیں انداز بیان بھی دشوار ہے لیکن یہ اس لئے کہ میں عقلائے دہر کی توجہ نفسِ مضمون کی طرف منعطف کر سکوں نیز اس کتاب میں دو رنگ پائے جاتے ہیں ایک تو فلسفیانہ رنگ ہے جو حکما مغرب کو مرغوب ہے اور دوسرا مذہبی رنگ ہے جو میرے قلب کی گہرائیوں سے پھوٹ نکلا ہے۔ پہلے رنگ کا ماخذ فکر ہے اور دوسرے کا ذکر۔ اور خدا کرے تو ذکر اور فکر دونوں سے لذت اندوز ہو سکے۔ آمین[1]

---

[1] میں نے علامہ کے اشعار آبدار کی توضیح محض اس لئے کی ہے کہ اس کتاب لاجواب کے مطالعہ کی اہمیت نوجوانانِ اسلام کے دلوں میں جاگزیں ہو سکے۔ کاش اسلامیہ کالجوں کے پروفیسر اپنے شاگردوں کی توجہ اس کتاب کی طرف منعطف کرا سکیں اور وہ ہیگل کے خیالی طلسم سے آزاد ہو کر عصرِ حاضر کے اس "منظرِ عظمیٰ" GREATEST - PHENOMENON کا مطالعہ کر کے اپنے دل و دماغ دونوں کو منور کر سکیں

آخر میں علامہ نے مسلمان نوجوان کو اس حقیقت سے آگاہ فرمایا ہے کہ مکتب کی تعلیم ڈگریاں تو بے شک دلا سکتی ہے لیکن دل میں سوز و ساز کا رنگ نہیں پیدا کر سکتی۔

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست
تا بجذب اندرونش راہ نیست

اور علم کی حقیقت یہ ہے کہ جب تک وہ عالم کے اندر سوز پیدا نہ کرے اس وقت تک علم "حجاب اکبر" ہی رہتا ہے۔

علم نا سوزے نگیرد از حیات
دل نگیرد لذتے از واردات

علم جز شرح مقامات تو نیست
علم جز تفسیر آیاتِ تو نیست

لہذا نوجوانوں کو اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اب یہ نصیحت پھر علامہ ہی کے لفظوں میں سنئے۔

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گرد خود گردندہ چوں پرکار باش

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد در فقر و غنا از کف مدہ

حکم دشوار است تاویلے مجو
جز بقلبِ خویش قندیلے مجو

حفظِ جانہا ذکر و فکرِ بے حساب
حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب

حاکمی در عالمِ بالا و پست — جز بحفظِ جان و تن نامد بدست

لذتِ سیر است مقصودِ سفر — گر نگہ بر آشیاں داری، بپر

در رہِ دیں سخت چوں الماس زی — دل بحق بر بند و بے وسواس زی

سترِ زن یا زوج یا خاکِ لحد — سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد

در جہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ — نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ

گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر — از اب و جد آنچہ من دارم بگیر

مگر ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدریؓ تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ

---

[1] میں نے انہی چند نصائح کے اقتباس پر اکتفا کیا ہے لیکن فرزندانِ اسلام سے درخواست ہے کہ وہ جاوید نامہ کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ حضرت مجددِ عصر نے ان کی دینی و دنیاوی ترقی کے لیے کیسی کیسی بیش قیمت نصائح بیان فرمائی ہیں اس کتاب کا آخری حصہ جس کا عنوان ہے "سخنے بہ نژادِ نو" خاص طور پر کالجوں کے طلبا کو پڑھنا چاہئے بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ اسے دینیات کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ کیا پشاور لاہور امرتسر دہلی کلکتہ مدراس اور بمبئی کے اسلامیہ کالجوں کے اربابِ اختیار اس طرف توجہ فرمائیں گے ؟

خطاب بہ مخدراتِ اسلام | جس طرح نوجوان قوم کا سرمایہ ہیں عورتیں یا مائیں وہ معدن ہیں جہاں سے یہ سرمایہ نکلتا ہے اور جس طرح قوم کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے نوجوانوں کا مستقبل ماؤں کے ہاتھ میں ہے اس لئے علامہؒ نے نوجوانوں سے پہلے (۱۹۲۰ء میں) رموزِ بیخودی میں قوم کی ماؤں سے خطاب کیا تھا۔ اوران کو ان کے فرائض یاد دلائے تھے۔ اس کا خلاصہ ذیل میں بیان کرتا ہوں۔

فرماتے ہیں کہ اے قوم کی پردہ نشیں خاتونو! بلاشبہ تمہاری فطرت پاکیزہ ہے اور ہمارے لئے تمہارا وجود باعثِ صد رحمت ہے تم قومی زندگی کی معمار ہو، تمہاری ہی آغوش میں بچہ سب سے پہلے کلمۂ توحید سے آگاہ ہوتا ہے اور اس کے عادات و خصائل تمہارے ہی سانچہ میں ڈھلتے ہیں چونکہ دورِ حاضر "ترفروش و پرفن" ہے، اس لئے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ:-

آب بندِ نخلِ جمعیت توئی — حافظِ سرمایۂ ملت توئی
از سرِ سود و زیاں سودا مزن — گام جز بر جادۂ آبا مزن
ہوشیار از دستبردِ روزگار — گیر فرزندانِ خود را در کنار
این چمن زادان کہ پر نکشادہ اند — ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند — چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند

تا حسینے شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشیں بگلزار آورد

مقامِ نسائیت

مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

خطاب بہ مسلمانانِ عالم | اگرچہ علامہؒ نے عورتوں کو جداگانہ پیغام دیا ہے اور نوجوانوں کو جداگانہ۔ تاہم ایک جگہ مجموعاً تمام مسلمانوں سے خطاب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ آخر کب تک دینِ اسلام کی طرف سے بے غیرتی اختیار

سلہ قوم کی عورتوں کو واضح ہو کہ حضرت علامہ ان سے اس بات کے متوقع ہیں کہ وہ اس دورِ الحاد میں اپنے بچوں کو اسلام پر استوار رکھنے کی کوشش کریں گی اور (۲) خود اپنی زندگی کو سیدۃ النساء حضرۃ فاطمۃ الزہراؓ کے نقشِ قدم پر چلائیں گی تاکہ ان کے بطون سے ایسی اولاد پیدا ہو، جو حضرت سید الشہداء امام حسینؓ کے نقشِ قدم پر چل سکے۔ میں اپنی قوم کی بہنوں سے درخواست کروں گا کہ وہ حضرت مجددِ عصرؒ کے پیغام کو گوشِ ہوش سے سنیں اور دل و جان سے اس پر عمل کریں تاکہ ہماری قوم پھر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکے۔

گئے رہو گے اور کب تک بے غیرتوں کی زندگی بسر کرتے رہو گے، اگر دل کے لئے دل میں غیرت نہ ہو تو اس بے غیرتی کی زندگی سے موت اچھی ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؂

وائے ما اے وائے ایں دیر کہن　　تیغ لا در کف نہ تو داری نہ من

دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جواں　　ایں جہاں کہنہ در باز اے جواں

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن　　اے مسلماں مردن است ایں زیستن

مردِ حق باز آفریند خویش را　　جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را

بر عیارِ مصطفےٰ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

علامہؒ نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب قوم کو اختیار ہے اپنا فرض پہچانے۔ انہوں نے عزت اور ذلت دونوں کے راستے دکھلا دئے ہیں۔ اب یہ قوم کی مرضی ہے جو راستہ چاہے پسند کرے۔

ایک التجا

میں اس دعا پر اس کتاب کو ختم کرتا ہوں جو حضرت علامہ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں نوجوانانِ اسلام کے لئے کی ہے ـ

این مسلمان زادۂ روشن دماغ ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

این غلام ابن غلام ابن غلام حریت اندیشۂ او را حرام

مکتب از وے جذبۂ دین در ربود از وجودش این قدر دانم کہ بود

این ز خود بیگانہ این مست فرنگ نانِ جو می خواہد از دستِ فرنگ

مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست در دلش لا غالب الا اللہ نیست

از فرنگی می خرد لات و منات مومن و اندیشۂ او سومنات

قم باذنی گو او را زندہ کن
در دلش اللہ ہو را زندہ کن

پروفیسر سلیم چشتی (بی اے) کی دوسری تصانیف

(۱) شرح اسرار خودی :- یہ کتاب مثنوی اسرار خودی کے مطالب و معانی کی شرح و تفصیل پر مشتمل ہے اور بہت مقبول ہے۔ اسکے کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ اگر ابتک آپنے اس کتاب کو نہیں پڑھا تو اب اولیں فرصت میں اسے پڑھئے۔
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

(۲) اقبال اور پیام حریت :- یہ کتابچہ دراصل پروفیسر صاحب کے ایک مقالہ پر مشتمل ہے جو آپنے ایک یوم اقبال پر لاہور میں پڑھا تھا اور بہت پسند کیا گیا۔ قیمت ۸/

(۳) شرح پس چہ باید کرد اے اقوام شرق :- ڈاکٹر صاحب نے اپنے کام اور پیغام کی ابتدا مثنوی اسرار خودی سے کی اور "مطلع کا بند" مثنوی "پس چہ باید کرد" کو بنایا۔ اس کتاب کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔ قیمت ایک روپیہ

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ اقبال پر آپ کو ذیل کی کتابیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔

(۱) اقبال پر ایک نظر :- قیمت دو روپے بارہ آنے
(۲) اقبال کے چند جواہر ریزے :- قیمت ۱۰/
(۳) اقبال کا تصور زمان و مکان - قیمت ۱۰/
(۴) موت و حیات اقبال کے کلام میں - قیمت ۴/
(۵) سیرت اقبال :- قیمت چار روپے بارہ آنے